

لیے کہ میرے محسن میرے آئندہ دل نے آج میری زندگی کے اس اہم ایونٹ کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ آج میں آپ سے اپنی ایک اور اہم خوشی بھی بانٹنا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری یو ایس اے روانگی ہے، چند ماہ بعد جب میں واپس آؤں گی تو شاید اُس وقت مجھے اس سفید چھڑی کے سہارے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہو گی اور یہ سب بھی میرے اسی محسن کی یہ دولت ہے۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی آتے ہیں، جن سے قدرت ہمارے نصیب کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ میری زندگی میں پہلے ایسے دو لوگ تھے، میری ماں اور میرے بچپن کا ساتھی عدنان، جنہوں نے قدم قدم میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے چھینے کی راہ دکھائی، مگر اب کوئی اور بھی ہے، جو میری خوشیوں کا ضامن ہے، جس کے ہوتے ہوئے، مجھے پورا یقین ہے کہ غم کبھی میرے آس پاس بھی جھٹک نہیں سکتا، کیوں کہ کچھ لوگوں کا وجود ہی ہمارے اندر روشنی بھردینے کے لیے کافی ہوتا ہے اور آج آپ لوگ جو میرے ارد گرد یہ خوشیوں کی بہار دیکھ رہے ہیں یہ سب اسی عظیم ہستی کی دین ہے۔ وہی جو میرے محسن، میرے آئندہ دل اور دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں میرے لیے..... "سارا ہال معنی کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں سے گونج اٹھا اور بہت دیر تک شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دی، لیکن ہال کے اس شور سے کہیں زیادہ شور اور جھنجھار خود میرے اندر رچی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اندر لگے آئینے میں دوسری جانب کھڑا پڑی زاد مجھ سے جھنجھک کر کہہ رہا تھا "تم ایک خود غرض انسان ہو پڑی زاد..... کیا کبھی تمہاری نام نہاد محبت ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے چلے ہو۔ کتنے کم ظرف ہو تم اور کتنی اعلیٰ ظرف ہے وہ کہ تمہیں اتنا مان دیتی ہے، مگر تم؟ تم اس مان کے قابل کہاں، تم بھی وہی عام دنیا دار نکلے پڑی زاد..... خود غرض اور مطلب پرست، جتنا تمہارا حق میلا ہے، اتنا ہی تمہارا من گدلا، یہی تمہاری اصلیت اور یہی تمہاری اوقات ہے پڑی زاد۔" میرے اندر کی آوازیں اتنی بلند ہونے لگیں کہ میں نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور ٹھیک اسی لمحے اس کی ملائم آواز سنائی دی۔ "پڑی زاد..... کہاں تجھے بیٹھے ہیں آپ! میں آپ کو سارے ہال میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے گھبرا کر معنی کی طرف دیکھا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے معنی کو کامیاب نمائش پر مبارک باد دے کر واپس پلٹ رہے تھے۔ "ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یونہی بس ذرا بھیڑ میں جی گھبرا رہا تھا۔ تم بتاؤ، تم خوش تو ہو ناں!! آج تم نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔" معنی ہنس پڑی، وہ بہت ہلکی پھلکی سی لگ رہی تھی۔ "جناب ایہ سارے معرکے آپ کیا وجہ سے سر ہو رہے ہیں۔ بتا ہے، عدنان تو مجھے کہتا ہے کہ آپ میری زندگی میں میرا کئی چارم بن کر آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے آپ کی شاعرانہ گفتگو میں، خوش نصیبی کا ستارہ۔" عدنان کے ذکر پر جیسے مجھے سب کچھ دوبارہ یاد آ گیا اور میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "مگر یہ عدنان ہے کہاں، دکھائی نہیں دے رہا؟" معنی مسکرائی "پتا نہیں، کہہ رہا تھا، مجھے کوئی سر پر اندر دینا چاہتا ہے۔ شاید اسی سلسلے میں باہر گیا ہے۔ بس آتا ہی ہو گا۔" میرے ہوش اُٹ گئے۔ عدنان تھا باہر نکل چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے معنی کو وہیں رکنے کا کہا اور جلدی میں باہر کی جانب پکا۔ میرے سارے خدشے شاید آج ہی درست ثابت ہو نا تھے۔ میری گاڑی کے قریب میرا ڈرائیور اور گھر کا دوسرا گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ میں نے جڑبڑائے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا "کبیر خان کہاں ہے؟" ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا کہ وہ کسی کام کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔ میرے ساتھ جانے کے لیے اس نے گھر سے دوسرا گارڈ طلب کر لیا تھا۔ اسی گارڈ نے مجھے بتایا کہ کبیر خان کسی پرائیویٹ گاڑی میں باہر نکلا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ یقیناً کبیر خان عدنان کے پیچھے گیا تھا تا کہ موقع پا کر اسے ختم کر دے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی، مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ نمبر ملایا میرے اندر سمندر کی تیز لہروں جیسا شور مٹا تھا۔ "فون اٹھاؤ کبیر خان، ورنہ آج ہم دونوں کے ہاتھوں ایک گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے گا۔ فون اٹھاؤ کبیر..... خدا کے لیے فون اٹھاؤ....." میں نے خود کلامی کرتے ہوئے پانچویں مرتبہ کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھالیا۔ میری آواز کانپ گئی۔ "تم کہاں ہو کبیر خان! جلدی واپس لوٹ آؤ۔" دوسری جانب ٹریک کا بہت شور تھا۔ "ہم ٹراک کے پیچھے آیا ہے صاب، تم فکر مت کرو، وہ اس وقت ٹھیک ہمارا نشانے پر ہے۔" میں نے جھج کر کہا "نہیں، کبیر خان! ابی غلطی مت کرنا۔ میرا حکم ہے کہ فوراً واپس آ جاؤ۔" دوسری جانب کبیر کو میری آواز ٹھیک سنائی نہیں دی۔ "بہت شور ہے صاب۔ ہم کام ختم کرتے ہی واپس آتا ہے۔ وہ لڑکا دوسرا گاڑی میں ہمارا نشانے پر ہے۔ بس ایک منٹ اور....." کبیر کی آواز کٹ گئی..... میں اتنی زور سے چلا یا کہ ساری پارکنگ میری آواز سے گونج اٹھی۔ "تم اس لڑکے کو نہیں مارو گے کبیر خان! یہ میرا حکم....." میری آواز درمیان ہی میں گھٹ گئی۔ دوسری جانب کے شور میں مجھے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے فائر کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فون زمین پر گر گیا۔

(جاری ہے)

باہم عدم توازن انسان کے پسندیدہ، ٹھیک کے معروف و منفرد مارا مارا، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پڑائی حاصل کی، تو جنگ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گھما دینا مگر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند و زور پرست دنیا کے آن گت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مست محمول ہے گا۔ ہمارا پتا وہی پڑتا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر، ڈو، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں سر پکا کروں زمین پر بیٹھ گیا، کچھ لٹھوں کے لیے ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اچانک مجھے یوں لگا، جیسے قریب پڑے میرے سبیل فون سے ابھی تک کبیر خان کی آواز آرہی ہو۔ میں نے جلدی سے فون اٹھا یا، دوسری طرف وہی تھا ”کیا ہوا صاب..... اس طرف بہت شور تھا، ابھی یلو.....“ میں نے چلا کر کبیر سے پوچھا ”کیا تم نے اسے مار دیا کبیر.....؟“ ”نہیں صاب.....“ اور سگٹل پر وہ بالکل نشا نے پڑ تھا، مگر چوک پر کوئی حادثہ ہو گیا، اس لیے رش جمع ہو گیا، مگر ہم اس کے پیچھے ہے، ایک سٹان سڑک پر.....“ میری آواز بیٹھ گئی ”نہیں کبیر خان، نہیں“ تم واپس آ جاؤ“۔ کبیر نے احتجاج کیا ”مگر صاب.....!!“ میں نے غصے سے چیخ کر کہا ”یہ میرا حکم ہے فوراً واپس آؤ“ ”ٹھیک ہے صاب“۔ کبیر نے فون کاٹ دیا۔ میں اس طرح گھر کے گھر سے سانس لے رہا تھا، جیسے میلوں زور سے بھاگ کر آیا ہوں، پھر مجھ سے وہاں غمرا نہیں گیا اور میں گھر واپس لوٹ آیا۔ خود کو کمرے میں بند کر کے اندھیروں کے حوالے کر دیا۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری بازی ہار آیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا میرے پاس۔ میرا بچی چاہ رہا تھا کہ میں تجوروں میں بھری اپنی ساری دولت کو، اس عالی شان گھر کے صحن میں جمع کر کے اپنے ہر اثاثے سمیت چلا کر رکھ کر دوں، آگ لگا دوں اس ساری جائیداد اور شان و شوکت کو، کس کام کا تھا یہ سب کچھ۔ اتنا لہذا سفر طے کرنے کے بعد بھی میرے دل کا دامن آج بھی اسی بڑی زادی طرح تہی دست اور خالی تھا، جو کبھی اسی شہر کے ایک کچے مکان میں رہا کرتا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دل کی دیران خالی بستیاں مقدروں سے بسا کرتی ہیں اور میرے نصیب میں میرے سن کی یہی سونی ہو چلی ہی کبھی تھی، لیکن اب میں اپنے اس دشمن دل کی مزید کسی چال میں آنے والا نہیں تھا۔ بہت سن مانیاں کر چکا تھا یہ اپنی، بڑی ذلت اور خواری اٹھائی تھی آج تک میں نے اس دل کے کہنے میں آکر، مگر اب اس وحشی دل کو سزا دینے کا وقت آچکا تھا اور مجھ جیسے دل بچلے جب خود کو سزا دینے پر آتے ہیں، تو وہ سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ اگلے روز میں نے ایک پاور آف انارنی کے ذریعے کچھ اہم فیصلے کیے۔ اپنے تمام پھیلے ہوئے کاروبار اور عملے کو ایک ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام کر کے سب کے حصے مقرر کر دیے۔ میری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ اسی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر پال کے پلاسٹک سرجری کے ادارے کو جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر پال کو ایک آخری ای میل لکھی۔ ”محترم ڈاکٹر پال! میں نے اپنی پلاسٹک سرجری کا کاروبار دھتوئی کر دیا ہے، کیوں کہ آپ ہی کے ادارے کی تعارفی سطر کے مطابق یہ بات بالکل درست لگتی کہ چہرے بدلے جاسکتے ہیں، مقتدر ہیں نہیں۔ اور مجھے شاید اس بات کا احساس بہت دیر میں ہوا کہ مجھے اپنی تقدیر بدلنے کی ضرورت چہرہ بدلنے سے کہیں زیادہ تھی، مگر افسوس، میں کسی ایسے ادارے کو نہیں جانتا، جو اللہ سے سفارش کر کے میری تقدیر بدل ڈالتا۔ میرے ادارے کی آمدنی سے ایک بڑا حصہ ہر ماہ آپ کے ادارے کو ملتا رہے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ یہ رقم ان لوگوں کے مفت علاج پر صرف کیجیے گا، جو اپنی سرجری کروانا چاہتے ہیں، مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میری آمدنی کا دوسرا بڑا حصہ میرے اپنے ملک میں ایسے پلاسٹک سرجری کے اداروں کو جائے گا، جو یہاں کے نادار مریضوں کے چہروں کا علاج کریں گے اور پوری سہولیات نہ ہونے کی صورت میں، ایسے لوگوں کو آپ کے ادارے تک پہنچائیں گے۔ میرا اسٹاف آپ کے ادارے کو یہاں کے اداروں سے منسلک کر دے گا۔ یہ میری آخری ای میل ہے، کیوں کہ اس کے بعد میں خود کو اس دنیا کی بھینٹ میں کہیں گم کر دوں گا، اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ جس کے لیے میں اپنے چہرے کی سرجری کروا کر اسے خوش نما بنانا چاہتا تھا، وہ کبھی میرے اس چہرے کو دیکھے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت یا ہم دردی کی وہ لہر پیدا ہو، جو اس سے میرا مقتدر ہے، اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ لمحہ میرے لیے موت کی اذیت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوگا۔ میں نے ساری دنیا کی نظریں جمیل لیں، مگر اس ایک نظر کو کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا..... دعا گو، پری زاد.....“

شام تک سارے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ کمالی سمیت چند دیگر میگزینز اور دفاتر عملے کے ارکان کو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا گیا۔ میرے بہن بھائیوں، دوستوں، رشتے داروں اور عملے سمیت کبھی کے لیے ماہانہ مشاہرے کے علاوہ حصے کے طور پر ایک معقول رقم مخصوص کر دی گئی۔ میں نے کچھ ایسا انتظام کر دیا تھا کہ میرے جانے کے بعد بھی سارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ جب کمالی کو میں نے رات گئے طلب کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم گھبرا سا گیا ”مگر سہرا! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور معاف کیجیے گا سہرا، یہ پاور آف انارنی سے کہیں زیادہ کوئی وصیت نامہ لگتا ہے۔ میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا، اسٹاف سے یہ سب کچھ اکیلے نہیں سنبھالے گا سہرا“ میں نے اسے تسلی دی ”فکرت کرو، سب یونہی چلتا رہے گا، اور میں کہیں نہیں جا رہا..... بس اچانک کچھ ضروری مسائل پیش آ گئے ہیں، اس لیے کچھ عرصہ شاید غیر حاضر رہوں گا اور یاد رہے، میرے کہیں جانے تک یہ کاغذ تمہارے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا یہ بھرم ضرور قائم رکھو گے“۔ کمالی کی چٹکیں جھجک گئیں ”میں آخری سانس تک آپ کا ہر بھرم بھجھاؤں گا سہرا، مگر یہ تو بتادیں کہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ کبھی آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟“ ”انی الفال تو میرا خود اپنے آپ سے رابطہ بھی ممکن نہیں ہے کمالی، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطلع کر سکوں۔ اب تم جاؤ، اور ہاں، کبیر خان کا خاص خیال رکھنا، ایسے وقت دار بہت نایاب ہوتے ہیں“۔ کمالی افسردہ سا، دل میں بہت سی باتیں لیے لوٹ گیا۔ کچھ دیر میں کبیر خان آ گیا۔ وہ کچھ پچ پچ سا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے ہے ابھی تک ناراض ہو کبیر خان؟“ کبیر نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”نہیں صاب..... ہم تو آپ کا غلام ہے۔ مگر آپ نے اس ڈاکٹر کو معاف کر کے اچھا نہیں کیا۔ دشمن پر رحم نہیں کھانا چاہیے، کیوں کہ جب اس کا وقت آئے گا تو وہ آپ پر رحم نہیں کرے گا“۔ میں نے ایک گہری سانس لی ”تم ٹھیک کہتے ہو کبیر خان، مگر محبت شاید ہمیں بزدل بنا دیتی ہے۔ کبھی کبھی محبت میں ہم ایسے لوگوں کو بھی جکڑ دیتے ہیں، جو خود ہمارے قتل کا باعث بن جاتے ہیں اور اس جنگل نما دنیا کا بس یہی تو قانون ہے، مار دیا پھر خود مر جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ میں نے خود کو مار دیا ہے کبیر خان.....“ کبیر سر اٹھ کائے واپس چلا گیا۔

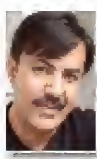
اگلے دو دن بھی پری زاد کا راز گئے اور پھر عدنان اور عینی کی امریکا روانگی کا دن بھی آ گیا۔ وہ دونوں بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ عینی کی اب بھی وہی ضد تھی۔ ”میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تین چار ہفتے میں سارے شہرے ہو جائیں گے، اور پھر آپ ریشن کے بعد ہم سب اکٹھے واپس

گھر واپس لوٹا تو آدھی رات وصل پہنچی تھی۔ میں نے ذرا تیر سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے، مگر کبیر خان کو اطلاع نہ کرے۔ مجھے شاید کچھ دیر کے لیے کسی کام سے باہر جانا پڑے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر میں نے روزمرہ اور ماہانہ خرچوں کے کچھ چیکس پر درج خط کیے اور کمائی کے نام ایک خط میں سارے معاملات کی تفصیل لکھ ڈالی۔ فجر سے کچھ دیر قبل میں تنہا گھر سے باہر نکلا اور ذرا تیر کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ یعنی کے جانے کے بعد میرا دل اور دماغ جیسے بالکل سن سے ہو گئے تھے۔ میں چل بھر رہا تھا، سانس لے رہا تھا، مگر زندہ نہیں تھا۔ پتا نہیں صرف سانس لینا ہی زندگی کی شرط کیوں ٹھہرا دی گئی ہے؟ چیون تو اس سے کہیں بڑھ کر اور سو ہے۔ ذرا تیر کو باہر انتظار کرتے چھوڑ کر میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچا تو کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار نہ تھی۔ میں نے پتا سوچے سمجھے آخری اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اور دو بجہ بندی کے انتہام کی فکر کیے بغیر پہلی بوگی میں سوار ہو کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ٹرین نے سٹی بجائی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا، مگر یادیں دماغ کا پلیٹ فارم بھلا کر چھوڑتی ہیں۔ ٹرین اسٹیشن در اسٹیشن ہوتی جائے کہاں چلی جا رہی تھی۔ لوگ ڈبے میں سوار ہوتے اور اپنی منزل آنے پر اتارے رہے، مگر میری منزل کہاں تھی۔ یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ دو دن بعد ٹرین کسی بڑے جھنڈن پر آ کر کھڑی ہو گئی اور کئی مسافر اتر گئے۔ پتا چلا کہ یہ آخری اسٹیشن ہے۔ اب اگلے دن سٹی ٹرین یہاں سے واپس میرے شہر تک جائے گی۔ کاش! یہ ٹرین تمام عمر یونہی چلتی رہتی، آگے بڑھتی رہتی اور اس کا کوئی آخری اسٹیشن نہ آتا۔ کتنا نادان تھا میں، کیا سوچ کر ٹرین میں آ بیٹھا تھا کہ میرے بقیہ تمام عمر کا سفر اسی ٹرین میں کٹ جائے گا۔ جب تیسری بار ٹرین کے عملے نے مجھے آ کر یہ بتایا کہ اب یہ گاڑی آگے کہیں نہیں جائے گی، تو میں نیچے اتر آیا اور کچھ فاصلے پر بیچھے کھڑی کے ایک پُرانے سے بیچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دنیا کے سارے ریلوے اسٹیشن شاید ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارا جھک ہی کہتا تھا، منزلیں اپنی جگہ ہیں، راستے اپنی جگہ۔ جب قدم ہی ساتھ نہ دیں، تو مسافر کیا کرے؟ یہاں پر موجود کبھی مسافر کوئی نہ کوئی منزل اور مقصد سفر رکھتے تھے۔ ہر کسی کو کہیں جانے کی جلدی تھی، بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد، بھینچر، جھوم اور بھانت بھانت کی بولیاں، غلٹ، زار اور راستوں کی فکر۔ کبھی کسی نہ کسی دھن میں گن تھے، مگر میں بے حس سا بیٹھا اطمینان سے یہ سب دیکھتا رہا۔ شام ڈھلی اور پھر گہری رات نے ڈیرے ڈال دیئے۔ میرے پیچھے وہاں گھر میں ضرور طوفان اچکا ہوگا۔ کئی گھنٹے انتظار کے بعد میرے واپس نہ لوٹنے پر کبیر نے ضرور اسٹیشن کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ہو کر تیر سے رابطہ کیا ہوگا یا وہ اس سے بھی پہلے میری تلاش میں نکل چکا ہوگا اور پھر جب ان لوگوں نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پایا ہوگا، تو گھر میں کہرام مچ گیا ہوگا۔ کمائی کو تو میرے جانے کا قصور بہت تھا، مگر کبیر تک کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ ضرور میری تلاش میں سب چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل پڑا ہوگا۔ کہیں وہ دوسری ٹرین پکڑ کر ہر اسٹیشن کھو جتا یہاں تک بھی نہ آ پہنچے۔ میں گھبرا کر ڈکھڑکیا گیا۔ گھر سے نکلے وقت میرے کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے میں بہت سے بڑے نوٹ ابھی باقی تھے۔ میں نے ٹکٹ گھر سے کسی دوسری مخالف سمت جاتی گاڑی کا ایک ٹکٹ لیا اور صبح سنا اندھیرے اس گاڑی میں سوار ہو کر پھر سے ڈبے سے باہر کی بھاگتی دنیا کا نظارہ شروع کر دیا۔ مجھے اپنے ماضی، اپنے دل کی حسرتوں اور اپنی پرانی پہچان سے کچھ ایسی ہوا ہو گئی تھی کہ میں نے اگلے کئی دنوں تک اسی بے مقصد سفر کو اپنی ذات کو محو دینے کا بہانہ بنا لیا۔ جہاں گاڑی ٹک جاتی، میں وہاں سے کسی اور جانب کا کوئی ٹکٹ لے کر کسی اور گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ مجھے شہروں یا بستیوں کے ناموں سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ ہی میں نے اس عرصے میں کسی ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر یا بستی یا گاؤں کو نظر کھر دیکھا تھا۔ میں تو بس چلتے رہتا تھا۔ میری شیوہ ہوتے بڑھتے دائرہ کی صورت اختیار کرنے لگی تھی اور میرے کپڑے دھول اور مٹی سے غرق ہو چکے تھے، مگر اب مجھے کسی چیز سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جہاں بھوک یا پیاس کا احساس ستاتا تو میں آکر کسی پلیٹ فارم پر گئے ٹکٹ سے پیاس ٹھہا لیتا اور کسی ٹھیلے والے سے کچھ لے کر کھاتا تھا، مجھ پر ایک عجیب سی حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ اسی دو گھنٹہ پانی اور چار گھنٹوں کے لیے ہم اپنی زندگیوں کو ٹھہر جھرتے جانے کیسے کیسے عذاب اور جو حکم میں ڈالے رکھتے ہیں، جب کہ ان دونوں چیزوں کا حصول کبھی اتنی زندگی کا طلب گار نہیں ہوتا، جتنی زندگی ہم اس بھوک اور پیاس کے لیے گنوا دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میری جیب میں موجود رقم ختم ہونے لگی اور پھر ایک دن جب کسی قصبے کے چھوٹے اسٹیشن پر میں نے جیب سے ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نکالنا چاہے، تو میرے ہاتھوں میں صرف چند سکنے آئے۔ میں نے الٹ پلٹ کر ساری جیبیں دیکھ ڈالیں، مگر کچھ بھی نہ پھانچا، میں تھکا ہارا سا اسٹیشن سے باہر آ گیا، ذرا ایک تانگے والا درخت کے سارے میں کھڑا اپنے گھوڑے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکا۔ ”کہاں جاؤ گے بادشاہو..... اس علاقے کے تو نہیں گتے۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے سکنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے ”جہاں تک یہ سکنے لے جاسکتے ہیں، لے چلو۔ اس بستی سے ہڈے، کسی ویرانے میں.....“ تانگے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”بستی سے ہڈے تو قبرستان ہے..... اوہ اچھا، اب سمجھا، کسی بڑے بوڑھے کی قبر پر فاتحہ پڑھتے آئے ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ، میں پہنچا دیتا ہوں۔“ میں پُپ چا پ تانگے کی کھجلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگے والے نے قصبے کے باہری سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک بڑے سے قبرستان کی چادر یاری کے باہر تانگا روک دیا۔ ”واپس جاؤ گے، میں یہیں انتظار کروں کیا؟“ میں خالی ذہن لیے چیخا اتر آیا۔ ”نہیں تم جاؤ، میں دیر تک یہاں رکوں گا۔“ تانگے والے کے چہرے پر ایک بار پھر بہت سے سوال اٹھرے، مگر میرا بے زار سا رویہ دیکھ کر اس نے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کی اور چابک مار کر تانگا سموز لیا اور کچھ ہی دیر میں ویران سڑک کے آس پاس کھڑے کھیتوں میں کہیں گم ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک یونہی باہر کھڑا سوچتا رہا اور پھر قبرستان کے کھڑی والے بڑے گیت کو دیکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ ذرا دیر تک ٹائی اور پرانی قبروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ میں قبروں کے کتبے اور ان پر لکھے سب وفات پڑھتا ہوا آگے بڑھتا رہا، کچھ تازہ قبروں پر اگر میتیوں کے چلے ہوئے ٹوٹے اور کچھ ہاش کے دانے کھڑے ہوئے تھے، مگر جھانے ہوئے خشک

چھوٹوں کی پٹیاں جا بجا بکھری تھیں۔ جانے لوگ مٹی میں چلے جانے والوں کے لیے اسے پھول لے کر کیوں آتے ہیں۔ اس کی زندگی ہی میں اسے کھایوں سے کیوں نہیں نہارتے۔ چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک درخت کے تنے سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

ایک عجیب سی خاموشی چاروں پہنچتی ہوئی تھی۔ انسان کی غم بھری فریاد اور چیخ پکار کا صلہ بس یہی اک خاموشی ہے۔ اچانک میرے بہت قریب ایک کرخت سی آواز ابھری۔ ”کون ہے بھی تو؟“ اور یہاں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک سخت گیر سا ہڈیوں کے ڈھانچے نما بوڑھا کر پر ہاتھ رکھے تاہوا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ ”میں..... وہ..... دراصل.....“ اس نے کڑے تیور سے میری طرف دیکھا۔ ”کوئی قبر کھدوانی ہے کیا؟“ ”نہیں نہیں، میں تو بس.....“ اس نے مجھے دوبارہ سر سے سر تک غور سے دیکھا۔ ”اچھا..... میں سمجھا، ڈاکٹری کی پڑھائی والوں کے لیے بڑائی قبروں سے بڑائی پڑانے آیا ہے تو..... پرکان کھول کر سن لے، فقیر! نام ہے میرا۔ میرے باپ دادا بھی اسی قبرستان کے گورکن تھے۔ خبردار، جو یہاں سے ایک ہڈی بھی ادھر ادھر کی..... ہاں، میرے ساتھ سیدھی طرح سودا کرے گا تو میں خود تیرے مطلب کی ہڈیاں تجھے بیچ دوں گا۔“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کرخت طبیعت بوڑھے کو کیسے سمجھاؤں کہ جو وہ مجھے سمجھ رہا ہے، میں وہ نہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نہیں، میں یہاں مردوں کی ہڈیاں تلاش کرنے نہیں آیا۔ تھک گیا تھا، اس لیے کچھ دیر کر بنگانے کے لیے رک گیا۔“ ”فقیرے نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کہیں تو اس چھوٹے قبرستان کے گورکن سلائے کا ساتھی تو نہیں ہے، بیچ بنا، کس ارادے سے یہاں آیا تھا؟“ مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے سخت لہجے میں فقیرے کو چھڑا دیا۔ ”تمہیں ایک باری کی بات سمجھ نہیں آتی کیا۔ میں کسی سلائے کو نہیں جانتا اور نہ ہی میرا اتھارہا قبروں کی اس جاگیر پر قبضے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں مسافر ہوں، بس راہ بھٹک کر اس طرف آگیا تھا۔ سوچا تھا، شاید یہاں کچھ مشکون مل جائے، مگر یہاں بھی تم جیسے زور پاری، ٹھیکے دار بیٹھے ہیں۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا۔ پیچھے سے فقیرے کی ڈھیلی سی آواز سنائی دی۔ ”زوراک تو سہی.....“ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ ”مخاف کرو، دراصل پچھلے چند دنوں سے یہ سارے گدھ میرے قبرستان پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک عامل کو بھی بھیجا تھا لوگوں کو ڈرا کر بھاگنے کے لیے۔ اس لیے میں سمجھا کہ پھر انہی کی کوئی شرارت ہے۔ نام کیا ہے حیرا، اس علاقے کا تو نہیں لگتا۔“ مجھے جلدی میں کوئی دوسرا نام نہیں سوچا تو میں نے اپنے پُرانے ڈرائیور کا نام بتا دیا۔ ”اکبر نام ہے میرا..... میں یہاں کانٹیں ہوں، بلکہ میں کہیں کانٹیں ہوں۔ نگہباز ہے نہ کوئی رشتے دار۔ بس، کوئی بستی بہشتی ہٹکتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی بھٹکتے ہوئے سی آگیا تھا۔ تم ناراض ہوتے ہو تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں۔“ ”فقیرا بالکل ہی نرم پڑ گیا۔“ ”اوٹھیں نہیں، بس ایسے ہی غصے میں کچھ زیادہ بک گیا میں۔ حیرا جب تک مجی چاہے، یہاں رہ سکتا ہے۔ آدمی تو مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ روٹی کھائے گا؟“ میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انٹیں الٹ دیا۔ ”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ ”فقیرا زور سے ہنس پڑا۔“ ”اوٹے بھٹلے اپنے کسی نہ مانگتے ہیں تجھ سے، چل آ جا، میری کوٹھری سہیں اسی قبرستان میں ہے۔ صبح ہی ایک مردہ دفنایا تھا، اس کے گھر والے بیٹھے چالوں کی دیگ بانٹ گئے تھے۔ ابھی بہت سے چاول پڑے ہیں۔“ میں چپ چاپ فقیرے کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی چھوٹی سی کنیا میں ایک جھلکا سی چار پائی کوٹنے میں پڑی پانی کی صراحی اور گلاس اور ایک جانب چھوٹی سی دیوار کے پیچھے بنے باورچی خانہ نما کونے میں چند پرانے سلور کے برتن پڑے تھے۔ ایک جانب گینتی، پیچھے کدال، رشتی اور قبر کھودنے کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ فقیرے نے ایک پلیٹ میں چاول ڈال کر میرے سامنے رکھ دیے اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ وہ یہاں تجارتا ہے۔ شادی اس نے کبھی کی نہیں، اور میری طرح اس کا بھی کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں شام ڈھل گئی اور جب میں فقیرے کی کنیا سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے فقیرے سے رخصت چاہی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کہاں جائے گا.....؟“ ”پتا نہیں، جہاں یہ رستہ لے جائے۔“ ”فقیرے نے چند لمحوں سوچا اور پھر مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”ٹو سہیں کیوں نہیں رہ جاتا، حیرا! کھانا بھی جو باجے گا اور میرا ہاتھ بنانے والا بھی مجھے مل جائے گا۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”مگر میں یہاں کیا کروں گا.....؟“ ”وہ زور سے ہنسا۔“ ”میری طرح قبریں کھودے گا اور کیا کرے گا.....؟“

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، نلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیقی کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رشتوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہدف پُرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گیل روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا.....!! میں نے آج تک کبھی کوئی قبر نہیں کھودی۔“ فقیرا زور سے ہنسا۔ ”جھوٹ ہوتا ہے تو! ہم سب تو ہر وقت کسی نہ کسی کی قبر کھود رہے ہوتے ہیں۔ فکر نہ کر، میں تجھے سب سکھا دوں گا، محنت سے جی تو نہیں چرائے گا؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”اب میرے پاس چرانے کے لیے کچھ نہیں ہے، جی بھی نہیں۔“ فقیرے نے سُنی اُن سُنی کر دی۔ ”ٹھیک ہے پھر آجا اور ہاں، ٹوٹنے یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں، لگتا ہے کسی گورے انگریز کی قبر سے چڑا کر لایا ہے یا پھر لٹے بازار کا مال ہے، گور کن ایسے کپڑے نہیں پہنتے، چل کیا یاد کرے گا، میں تجھے اپنا ایک جوڑا دے دوں گا، کپڑے بدل کر آرام کر لے، صبح بڑا کام کرتا ہے۔“ ہم دونوں اندر جھوپڑی میں داخل ہو گئے۔ فقیرے نے کسی کو نہ میں پڑے ایک ٹرنک سے ایک ہسٹریا گدیا اور ایک چادر نکال کر میرے حوالے کر دی۔ ”میں ایک طرف اپنا ہسٹریا ڈال لے اور میں رات کو ذرا دیر سے سوتا ہوں، تیری آنکھ لگے تو بھلے سو جانا۔“ فقیرے نے اپنی جیب سے ایک مخصوص براؤن کی بیڑی نکالی اور اپنی چارپائی کے نیچے کے نیچے سے ایک پڑا نکالی اور کاغذ میں لپیٹی بہت سی بھورے رنگ کی راز لٹا تیلیوں میں سے ایک چُن کر اُسے اپنی بھٹی پر رکھ کر رکڑنے لگا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس تیلی کی ایک چھوٹی سی گولی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے وہ گولی بیڑی کے تبا کو میں شامل کر کے بیڑی دوبارہ جوڑ کر سلگالی۔ جھوپڑی میں ایک عجیب سی ناگوار بو پھیل گئی۔ فقیرے نے زوردار تیسرا کش لگایا اور دھواں فضا میں پھیلا کر بولا۔ ”کبھی چس پنی ہے اکبرے.....؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ زور سے ہنسا۔ ”اچھا ہے نہ پیا کر، خون بھی جلا کر پی جاتی ہے یہ کم بخت۔“ پر میرا اس کے ہٹا گزارا نہیں، قبرستان کی راتیں بڑی کالی اور لمبی ہوتی ہیں، سچ بتاؤں تو نوجوانی میں مجھے یہاں اکیلے رہتے بازار لگتا تھا، بس انہی دنوں میں یہ لت لگ گئی۔“ فقیرا ساری رات نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی رام کہانی سن رہا۔ شاید اسے بہت دنوں کے بعد کوئی سننے والا ملتا تھا، پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک وہ بولتا رہا، میرا دھیان ہٹا رہا، مگر خاموشی ہوتے ہی میرے اندر رُخسے کئی آسیب اور عفریت مجھے سالم ننگے کے لیے اندھیرے میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

مجھے گھر چھوڑے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب تک تو انہوں نے تھک ہار کر میری کھوج ختم کر دی ہو گی۔ وہاں نیویارک میں مینی کے تمام ٹیسٹ ہو چکے ہوں گے اور شاید آج کل میں اس کا آپریشن بھی ہونے والا ہو گا۔ وہ مجھے مین وینٹ پر وہاں نہ پا کر کتنی مایوس ہوئی ہو گی، مگر یہ مایوسی یقیناً اُس مایوسی سے کہیں کم ہو گی، جو آنکھیں ملنے کے بعد اسے مجھے دیکھ کر ہوئی۔ عدنان نے ضرور اسے سمجھا دیا تھا کہ آپریشن پر راضی کر لیا ہو گا۔ کتنی خوش ہو گی وہ، جب پہلی بار، برسوں بعد اس دنیا کے رنگوں کو اپنی خوب صورت آنکھوں سے دیکھے گی۔ ساری رات باہر قبرستان کے دیرانے سے گیدڑوں، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں اور فقیرا بے غصہ پڑا اُٹھنے لیتا رہا۔ وہاں میرے آس پاس سب ہی تو سو رہے تھے، کچھ اپنی اپنی قبروں میں اور فقیرا اپنی چارپائی پر، بس ایک میں ہی تھا، جسے فینہ نہیں آ رہی تھی۔ صبح ہوئی تو فقیرا اپنے اوزار اٹھا کر میرے ساتھ کٹیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے آس پاس پھر کرٹی قبر کے لیے جگہ منتخب کی اور پھر کسی بوڑھے گدھ کی طرح قبرستان کے داخلی دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ گھٹنے بھر بعد ہی کچھ غم زدہ سے لوگ قبرستان میں داخل ہوئے اور فقیرے کو نئی قبر کا بیعت پکڑا گئے۔ فقیرے نے ان کے جاتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”واہ بھی اکبرے تو تو میرے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا ہے، پتا ہے دو دن سے فارغ بیٹھا تھا میں۔ کوئی مر کر ہی نہیں دے رہا تھا ساری بستی میں۔ چل آجا شاہا، ہمیں گھٹنے بھر میں قبر تیار کرنی ہو گی، وہ لوگ دوپہر کی نماز کے بعد آئیں گے۔“ میں کسی معمول کی طرح کام میں جُت گیا۔ فقیرا اپنے کام کا ماہر تھا، جلد ہی اس نے چھ فٹ گہری قبر کھود کر مغرب کی جانب لحد تیار کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مٹھی اٹھاتا اور قبر کی تیاری کے آزمودہ نسخے بھی بتاتا جا رہا تھا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میں نے دینی کے ابتدائی ایام میں اس سے کہیں زیادہ سخت محنت مزدوری کی تھی، مگر درمیانی عرصے میں مشقت کی عادت مجھ سے چھوٹ گئی تھی، لیکن میں فقیرے کے ساتھ جتا رہا۔ میں خود کو اس قدر تھکا دینا چاہتا تھا کہ جسم کی فوجی رگوں سے میرے ماضی کی یادوں سمیت میری جان بھی قطرہ قطرہ بہہ کر نکل جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ آ گیا، مرحوم کے ورثاء نے روتے دھوتے افسردہ اور سوگوار ماحول میں لاش کو قبر میں اتارا اور سب نے مٹی ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فقیرا اس تمام عرصے میں ایک جانب لاطعلی سا بیٹھا بیڑیاں چھو نکلتا رہا، مگر یہ رات دانی ”فاس“ بیڑی نہیں تھی۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے مجھے گھنٹی ماری۔ ”ابھی دیکھنا کچھ ہی دیر میں ان رونے دھونے والوں میں سے سگریٹ پینے والے دھیرے دھیرے ایک جانب سر کنٹا شروع ہو جائیں گے اور ایک دو کی ٹوبوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ، بیڑی چھو نکلیں گے اور اپنے کاروبار کی باتیں شروع کر دیں گے۔“ اور پھر کچھ دیر میں واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرایا۔ ”برسوں سے دیکھ رہا ہوں یہ ڈراما..... سگریٹ ایسی ہلا ہے، جھوٹ بھی بھلا دیتی ہے اور تجھے اب کیا بتاؤں اکبرے۔ میں نے تو یہاں جنازے پر بھی نشے میں ڈھٹ لوگوں کو آتے دیکھا ہے، کم بخت کہیں بیٹھے پی رہے ہوتے ہیں کہ کسی اپنے کی موت کا پیغام آ جاتا ہے، بھاگے دوڑے قبرستان تو پہنچ جاتے ہیں، آخری منہ دکھائی کے لیے، مگر قدم زمین پر نہیں پڑتے ٹھیک طرح۔“ میں نے فقیرے کے ہاتھ میں کپڑی بیڑی غور سے دیکھی۔ ”تم بھی تو سارا دن یہ دھواں اندر اندر لپٹے رہتے ہو، میں نے فٹا ہے اس سے کینسر ہو جاتا ہے۔“ فقیرے نے بڑی مشکل سے اپنی فنی پر قابو پایا۔ ”کو بھی ان جالوں کی باتوں پر یقین کرتا ہے اکبرے، میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہے، پندرہ سال کی عمر میں میں نے پہلا کش لگا یا تھا، یقین کر آج تک کبھی نہ کام بھی نہیں ہوا مجھے، جب کہ میں نے اسی قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایسے تیس چونتیس سال کے جوان مردے بھی دفنائے ہیں، جنہوں نے عمر بھر تبا کو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور اُن کے ساتھ آنے والے اس بات پر حیران تھے کہ نہ تو سگریٹ چیتا تھا، نہ شراب، پھر اچانک ہی کیسے گزر گیا۔ اب بول کیا بولتا ہے، حیرے حساب سے تو مجھے کب کا کینسر سے مر جانا چاہیے تھا۔“ میں لا جواب ہو گیا۔ ”تو پھر یہ ہر سگریٹ اور بیڑی کے پتے پر موت کا ڈرا دیکھ دیتے ہیں؟“ فقیرے نے دبا دبا سا قہقہہ لگایا کہ اس کی آواز قبر پر مٹی ڈالتے ورثاء تک نہ پہنچے۔ ”مجھے تو یہ بھی کچھ بڑوں کی دکان داری لگتی ہے اکبرے! یہ کیا بات ہوئی بھلا زہر ہے، تو پھر بیچتے کیوں ہیں گھلے بازار میں، بند کر دیں اس کی فروخت۔“ مرحوم کے ورثاء دعا سے فارغ ہو کر دھیرے دھیرے پلٹ رہے تھے۔ قبر پر عطر، کیوڑے اور گلاب کی چٹائی کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ فقیرے نے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ”اب کچھ دن تک اس قبر کے اوپر بڑی روٹی رہے گی، روزانہ کچھ لوگ آئیں گے، پھر دھیرے دھیرے ویرانی چھا جائے گی، سب اپنی اپنی دینداری میں الجھ کر یہاں سوتے شخص کو بھول جائیں گے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اکبرے.....!“

شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل فقیر بازار سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان اور تازہ میز کی کچھ بڈل تھے۔ اس

نے کچھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”یہ تیری مزدوری کا حصہ ہے، آدھے پیسوں کا میں سامان لے آیا ہوں۔“ میں نے دو روپے دوبارہ اس کی پٹھلی پر رکھ دیے۔ ”یہ تم ہی رکھو، اب مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ فقیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”تو بھی پورا اٹک ہے، چل ٹھیک ہے، میرے پاس ہی جمع رہنے دے۔“ رات ڈھلی تو باہر قبرستان میں کچھ فاصلے پر عجیب سی منتر پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ فقیر اجمو پڑی کے باہر بیٹھا میز پر چوک رہا تھا۔ ”یہ آوازیں کنسی ہیں؟“ فقیر نے حسب عادت بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ”کوئی عامل کسی زانی کو بے وقوف بنانے کے لیے مفر پڑھ رہا ہے۔“ میں نے دُور اندھیرے میں دیکھا تو واقعی کوئی جلی جڑ نما شخص چند پہنے دو تین عورتوں سمیت ایک قبر کے گرد بیٹھا آگ جلائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ”یہ سب کیا ہے فقیرے.....؟“ ”یہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سے پریشان ہے اور اپنی سو کن کو اسی قبرستان میں پہنچانا چاہتی ہے، لہذا اس نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اس عامل کو کالے عمل کے لیے رقم دی ہے، یہ بے وقوف عورتیں گھر سے ٹھپ کر یہاں آئی ہیں اور رات بھر میں اچھی خاصی رقم اس ڈھونڈی کو پکڑا کر واپس چل دیں گی۔“ میں نے حیرت سے فقیرے کو دیکھا۔ ”مگر تم اپنے قبرستان میں یہ ڈراتے بازی کیوں ہونے دے رہے ہو؟“ ”اوئے اکبرے! اٹھو واقعی بڑا بھولا ہے، جھٹلے ایسے عامل مجھ سے پہلے ہی سودا کر چکا ہے، آدھے پیسے میری جیب میں آگئے۔ کبھی کبھی تو ان جھوٹے عاملوں کے کہنے پر میں خود ہی کسی پرانی قبر میں لیٹ جاتا ہوں اور ان کے عمل کے بیچ میں منہ سے ڈرونی آوازیں نکالتا ہوں، تاکہ باہر بیٹھے لوگ اپنے ہر صاحب کی ”کرامت“ کا یقین کر لیں، یاد رکھ اکبرے، قبرستان میں جو بھی دھنڈا ہوتا ہے، اس کا آوا حض قبرستان کے رکھوالے اور گور کن کو جاتا ہے۔“ میں حیرت سے منہ کھولے فقیرے کی باتیں سن رہا تھا۔ میں تو جیسے جیسے انسانوں کی دنیا کے پھندوں اور مکر و فریب کے جال کو رو رہا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں مردوں کی بستی کے بکھیرے زندوں سے بھی نرالے ہیں۔ اُس رات فقیرے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پرانی اور خالی قبریں باقاعدہ نشے باز اور جواہروں کو کرائے پر دی جاتی ہیں، تاکہ ودرات بھرا پنا شغل اطمینان سے جاری رکھ سکیں۔ علاقہ حوالدار بھی حصہ ملنے کے بعد یہاں کا رُخ نہیں کرتا۔ جلی عامل اور جڑ اپنے بے گرا کیوں پر اثر اور رعب ڈالنے کے لیے کھلی ملاقات ہی میں انہیں اپنے ڈیرے سے سیدھا فقیرے کے قبرستان بھیج دیتے ہیں کہ جا کر فلاں قبرستان کی فلاں قبر کے سرہانے کھدائی کرو، تمہارے خلاف دبا گیا تعویذ یا سحلی عمل دیں ملے گا۔ ضرورت مند بے چارہ جا بھاگا قبرستان آتا ہے، جہاں فقیر پہلے ہی سے کسی کالی مرغی کا سر، مزے ہوئے انڈے یا کسی بکرے کی سری دبا چکا ہوتا ہے۔ سائل اپنے عامل کی کرامت کا بھرپور نظارہ دیکھ کر اپنی غریبہ کی پونجی عامل پر لٹا دیتا ہے اور فقیرے کا حصہ اُسے مل جاتا ہے۔“ میں دن بھر بیٹھا حیرت سے فقیرے کی باتیں سن رہا تھا۔ ”ہر جا بھانہ دنگر“ کا مطلب مجھے اب سمجھ آ رہا تھا۔ میرا دن تو ان سب روزمرہ کی مصروفیات میں گزر جاتا تھا اور میں خود کو شدید حد تک تنہا کرنے کے لیے فقیرے کے حصے کا کام بھی خود کرنے لگا تھا، مگر رات کاٹے نہیں کتنی تھی۔ اچانک ہی کسی پہرہ میری آنکھوں کے درمیان کھول کر میرے دل کے آگن میں آکر بیٹھ جاتی، میں لاکھ خود کو چھپاتا، اپنی آنکھیں میچ لیتا، مگر وہ مجھ سے ہم کلام رہتی۔ مجھے اپنے شب و روز بتاتی، میری کرخت انگلیاں، کدال اور پیچلے چلانے سے کھر دے چھالوں بھرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتی اور مجھ سے شکوہ کرتی کہ میں اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں، پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اجمو پڑی سے باہر نکل کر ساری رات تارے گنتا رہتا۔

ایک ایسی ہی رات فقیر ابھی میری آہٹ پر باہر آ گیا۔ ”کیا بات ہے اکبرے! اٹھو سوتا کیوں نہیں ہے، کوئی پریشانی ہے، تو مجھے بتا، جو ان جہاں بندہ ہے تو، کہیں کوئی عشق و شوق تو نہیں ہو گیا تھے.....؟“ ”میں مسکرا دیا۔ ”کیوں کیا وہ سارے جواہروں کو جاتے ہیں، ان سب کو عشق کی بیماری ہوتی ہے کیا؟“ ”فقیر ابھی ہنس پڑا۔ ”ہاں اپنا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جو انی کے یہ رت جگے عشق کا نتیجہ ہوتے ہیں، تو شادی کیوں نہیں کر لیتا، کب تک یوں اکیلا درد خوار ہوتا رہے گا؟“ ”اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، تو پھر.....؟“ ”فقیرے نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”اونٹیں پار..... یہ زانیاں بڑی مٹھلی ہوتی ہیں، ان سے بندہ دُور ہی رہے تو اچھا ہے، میں نے تو آج تک یہی دیکھا ہے کہ دنیا میں جتنے مسئلے ہوتے ہیں، انہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، اچھا خاصہ مرد ان کے چکر میں نہ دین کا رہتا ہے، نہ دنیا کا۔“ میں نے غور سے افسردہ فقیرے کو دیکھا۔ ”پھر تو میرا ٹک سولہ آنے بچ ہے کہ تم نے بھی کبھی کسی سے بھرپور عشق کیا ہے فقیرے..... ورنہ یوں غم زدہ نہ بیٹھے ہوتے۔“ ”فقیر نے تازہ میز سلگائی۔ ”کیوں دل پٹوری کرتا ہے اکبرے، ہاں تھی ایک..... یہیں قبرستان میں ملاقات ہوئی تھی، جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، میں نے اس پر بڑا خرچ کیا، ہر مشکل وقت میں سہارا دیا، پر جیسے ہی اسے مجھ سے بہتر بندہ ملا وہ بول نکاح کے پڑھوا کر جانے کہاں چلی گئی، پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مجھ سے۔ بس، اسی دن سے میرا ان عورتوں سے اعتبار اٹھ گیا، میری بات کان کھول کر سن لے اکبرے، یہ زانیاں کسی کی نہیں ہوتیں، کبھی ان کے چکر میں نہ پڑتا۔“ اب میں اسے کیا بتاؤں کہ یہ ودرات مجھ پر جانے کتنی مرتبہ بیت چکی ہے۔ اگلی رات دُور کسی قبر کے سرہانے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اگرچہ میں ان باتوں کا بہت حد تک عادی ہو چکا تھا، مگر آوازیں اتنا درد تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کینا سے باہر نکلنے لگا تو فقیرے نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”باہر نہ جا اکبرے! کوئی دکھیا رہی ہے، قبر پر چلنے کاٹے آئی ہے اولاد کے لیے۔“ میں نے بھرت سے فقیرے کو دیکھا۔ ”مگر قبر پر چلنے کاٹنے سے بے اولاد کی کیسے دُور ہو سکتی ہے؟“ ”فقیرے نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تو سمجھتا کیوں نہیں، یہ سارے کم زور عقیدے کے لوگ ہیں، میں نے تو یہاں عورتوں کو اولاد کی خواہش میں کسی نو مولود بچے کی قبر پر نہانے کا نسخہ لے کر آتے بھی دیکھا ہے، بس جو ہو رہا ہے، اسے ہونے دے۔ ہم ان کو یہاں آنے سے روکیں گے، تو یہ کسی اور قبرستان چلے جائیں گے۔ تو چپ کر کے سو جا۔“ میں نے زمین پر سر ٹکالیا، مگر میرا دھیان اب بھی باہر تھا۔ ”فقیرے.....! کیا تم نے کبھی کوئی اچھی بات نہیں دیکھی اس قبرستان میں؟“ ”ہاں بالکل دیکھی ہے، ایک بار کسی اللہ والے کو دفنا گئے تھے، لوگ یہاں پتا نہیں، کتنے دن اس کی قبر سے تازہ گلاب کی خوشبو آتی رہی اور کبھی کبھی تورات کے اندھیرے میں مجھے وہ قبر بہت نورانی بھی محسوس ہوتی تھی، جیسے روشنی نکل رہی ہو اندر سے، اور کبھی کبھی کسی گناہ گار کی قبر سے عذاب کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ دیکھ اکبرے..... قبر میں جانے کے بعد بندے کا رابطہ دائر یکٹ اس کے رب کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر میرے تیرے جیسے گناہ گار انسانوں کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے، سو جا چپ کر کے، کل صبح فجر کے بعد ہی ایک قبر کھودنی ہے، مغلزادہ رقم ملے گی ان شاء اللہ۔“

اگلے روز فقیر انہیں سے اخبار اٹھا لایا۔ ”چل بھی اکبرے، منڈو او کیٹھے چلتے ہیں۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”منڈو.....؟“ ”ہاں یار! وہ کیا کہتے ہیں سینما، یہ دیکھ بڑی زبردست کچر لگی ہے بازار والے سینما میں۔“ میں نے اخبار پر نظر دوڑائی تو میرے ہاتھ کپکپا سے گئے۔ لیٹی کی فلم ریلیز ہو چکی تھی اور سُر ہٹ ہو کر سلور جوبلی منانے کو آئی تھی۔ میں بہت دیر تک فلم کی خبریں پڑھتا رہا۔ اسے بستی عرف شہ پادہ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دیا جا رہا تھا۔ شہ پادہ کا نٹرویو بھی پھپھاتا تھا، جس میں اس نے ٹھل کر مجھے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ پری زادنہ ہوتا تو یہ فلم کبھی بن ہی نہ پاتی۔ اس نے میرے لیے پیغام بھی چھوڑا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ جان لوں کہ شہ پادہ کا خواب پورا ہو گیا ہے اور اس نے پری زادنہ کو اپنا خواب گر، اپنا سب سے بڑا محسن قرار دیا تھا۔ میں ایک دم بہت اداس ہو گیا۔ میں نے فقیرے کو اکیلے فلم دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ فلمیں دو لوگ دیکھتے ہیں، جو خواب دیکھنا جانتے ہوں، وہ اپنے کسی خواب کو سینما کے پردے پر جیتا جگانا دیکھنا چاہتے ہیں، مگر میرا تو کوئی خواب ہی نہیں بچا تھا، سب چنے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے، میں بھلا اب اس قابل ہی کہاں تھا کہ کوئی خواب دیکھ سکتا۔ فقیرے کے جانے کے بعد میں نے سارے اخبار کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے چھ ماہ زائد ہو چکے تھے، مگر اخبار کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے کل کی بات ہو۔ وہی برفیں اور کاروبار کی خبریں، وہی جھگڑے فساد کی باتیں، وہی شادی، بیاہ کی تقریبات، وہی دنیا جھ کر لینے کے دعوے..... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ہم انسان کتنے بولے ہوتے ہیں، جو یہ سوچ لیے

بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی سب کچھ رُک جائے گا یا بدل جائے گا، مگر کچھ نہیں رہ سکتا، کچھ نہیں بدلتا۔ سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے، بس ہم نہیں ہوتے۔ گویا ہمارا ہونا سب برابر ہے، تو پھر اس نہ ہونے کے برابر ہونے کا اتنا زعم کیوں، اتنا گھمٹھ کس لیے.....؟ مجھے پھر اس دھمن جاں کا خیال ستانے لگا۔ اب تک تو اس کی چٹائی واپس آ چکی ہو گی، جانے وہ واپس آنے کے بعد مجھے یاد بھی کرتی ہو گی کہ نہیں۔ میں آتے وقت دفتر اور گھر سے اپنی ہر ممکن تصویر جلا کر وہاں سے نکالتا تھا، تاکہ جب کبھی عینی واپس آئے تو اسے میری کوئی بھی صورت دکھائی نہ دے جائے۔ ویسے بھی میں شروع ہی سے تصویریں کھینچوانے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک بار تو ضرور میرے گھر یا دفتر آئی ہو گی اور اس کی آنکھوں نے مجھے وہاں کھو جا بھی ضرور ہو گا۔ کیسی دکھتی ہوں گی، اس کی وہ کھوجتی ہوئی آنکھیں..... اس نازنین نے میرے دفتر اور گھر کے نرم قالین پر اپنے نازک قدم رکھتے ہوئے میرے زیر استعمال چیزوں کو چھوا بھی ضرور ہو گا۔ پھر وہ عدنان کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر روٹی رہی ہو گی، مگر عدنان نے اسے سنہال لیا ہو گا۔ اس کی کوئل جبین کو عدنان کا شانہ ہی چٹا تھا۔ میری اس بے وقعت زندگی کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں کسی طور اس کی یادوں میں زندہ رہوں۔ کہ میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں..... مری جاؤں، جو تم فرصت ہو۔

مگر مجھ جیسے کم نصیبوں کو مرنے کی فرصت بھی کہاں میسر تھی۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن فقیر اصح سورے کسی کام سے بازار گیا تو شام تک واپس نہ لوٹا۔ میں چھوٹی پڑی کے باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک پولیس کی پرانی ویز جیپ قبرستان میں داخل ہوئی اور میرے قریب آ کر رُک گئی۔ خاکی رنگ کی جیپ سے دو سپاہی نیچے اترے اور ان میں سے ایک نے حسب عادت کڑا کر مجھ سے پوچھا۔ ”اکبر تیرا ہی نام ہے؟“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”ہاں، سب خیر تو ہے.....؟“ ”خیر نہیں ہے، تیرے ساتھی فقیر سے پر ساتھ والے چھوٹے قبرستان کے گور کن سلائے اور اس کے دوستوں نے حملہ کر دیا ہے، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، جلدی چل، وہ تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“ میں بوکھلایا سا ان کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پولیس والوں کی آپس میں بات چیت سے مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کی بہت پرانی دشمنی چلی رہی تھی، قبرستان کی حد بندی پر، اور آج فقیر، سلائے اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ہم اسپتال پہنچے تو فقیر آخری سانس میں لے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”دیکھ لے اکبرے! قبرستان کے دھندے نے قبر تک پہنچا دیا، پر ٹوائی غلطی نہ کرنا، بندہ جتنی بھی حد بندیاں کر لے، اس کی آخری حد اس کی قبر ہی ہوتی ہے۔“ فقیر اور میرے دھڑلے سے غنودگی میں چلا گیا اور پھر دوبارہ کبھی ہوش کی دنیا میں واپس نہیں آیا۔ سلائے اور اس کے ساتھی قتل عام کے جرم میں پکڑے گئے اور سرکاری وکیل نے عدالت کے ذریعے انہیں سولی تک پہنچانے کا پورا بندوبست کر لیا۔ فقیر سے کوئی کامیابی کا جائزہ، قبرستان کی چھوٹی سی قبر میں اتار دیا گیا۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا اور فقیر کے کے چالیسویں کے بعد میں نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اسٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑ لی، پھر سے وہی سفر اور وہی انجان رستے.....! مگر میری حالت روز بہ روز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ جاڑے کا اثر تھا یا پھر مسلسل برسات کا، مگر میرا بدن چپنے لگا اور پھر شدید تیز بخار نے مجھے آگھیرا۔ مجبوراً مجھے ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اتار پڑا۔ فقیر اٹھنے ملگ کہہ کر چھوڑا تھا، مگر اب میرا حلیہ اور میری ظاہری حالت واقعی کسی ملگ سے بھی بدتر تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی، لہذا میں نے اپنی پرانی چادر کی بٹل مار کر خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دُور چائے کے ٹھیلے پر گرم گرم چائے بنا رہی تھی۔ ٹھیلے پر بد نما سی لکھائی میں لکھا تھا ”خانو کی چائے، ہر قسم بیگائے“ ٹھیلے والے نے مجھے ٹھہرتے دیکھا تو ایک کپ چائے لے کر میرے قریب آ گیا۔ ”چائے پیو گے؟“ میں نے انکار کیا۔ ”نہیں مجھے طلب نہیں ہے۔“ ٹھیلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”عجب بھکاری ہو، کبھی میں خود اپنی مرضی سے دے رہا ہوں، تجھ سے پیے نہیں مانگ رہا خانو!“ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھکاری.....؟ ہاں ٹھیک کہا تم نے، میں بھکاری ہی ہوں، بہت بھیک مانگی ہے میں نے ساری زندگی، پر کچھ نہیں ملا..... اب کچھ چاہیے بھی نہیں، جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔“ خانو جانے میری ڈانٹ کو کیا سمجھا کہ اس کا لہجہ ایک دم عاجزانہ ہو گیا۔ ”معاف کرنا سائیں! تم تو کوئی اللہ لو کہ ہو، مجھ سے گستاخی ہو گئی۔“ میں نے اسے ہماڑ دیا۔ ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں کوئی سائیں نہیں ہوں، اکیلا چھوڑ دو مجھے!“ خانو نے جاتے جاتے بھی تین بار مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگالی، جس کے تنے کے ارد گرد بچائی انٹوں اور سینٹ کا چوبارہ اشیا کر ایک گول پلیٹ فارم سبنا دیا گیا تھا۔ پھر مجھے بتای نہیں چلا کہ میں کب مکمل بے شدہ ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنوں نے میری آنکھیں چند حیا دیں۔ میرے ارد گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھی تھی اور وہ سب آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آنا دیکھ کر خانو نے سب کو ڈانٹ کر ایک طرف سمیٹا۔ ”چلو بابا.....! کیا بھیڑ لگا رکھی ہے..... جو گی بابا کو ہوش آ گیا ہے، شاید لمبے مراقبے میں چلے گئے تھے۔“ میں نے چو تک کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ذرا مارا کٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور صحبت“ اور ”پچھلے سہر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سٹڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انھیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے آن گنت بد صورت رشتوں، بدینت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بولے گا۔ ہمارا ہوا ہی پر اتنا ہے:

ایڈیٹر، ”سٹڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

دوسب ہاتھوں میں لٹھوں کے ہار لیے یوں سر جھکائے میرے ارد گرد دائرے میں کھڑے تھے، جیسے میں کوئی پیر، ولی یا بزرگ ہوں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوا اور نقاہت سے چکرا گیا۔ میرے ڈمگائے جسم کو تھانے کے لیے کئی ہاتھ بہ یک وقت آگے بڑھے، تو میں نے سب کو جھٹک دیا۔ ”تم لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، جاؤ یہاں سے، مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ خانو نے دوبارہ سب کو جھڑپا، جیسے وہ میرا نائب ہو۔ ”منا نہیں بابا! جاؤ یہاں سے ابھی۔“ سائیں جلال میں ہے۔ ”لوگ عقیدت سے سلام کرتے وہاں سے بادل خواستہ ٹھٹھٹے گئے۔“ خانو نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ”کھانا کھاؤ گے سائیں؟“ میرا صبر جواب دے گیا۔ ”آخر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“ خانو منمنایا۔ ”آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں سائیں! شاید آپ کی دعا سے خانو کے دن پھر جائیں۔“ پچھلے سال ہاڑھ میں میرا سب کچھ بہہ گیا تھا۔ ادھر ٹرینوں کی بد حالی نے بھی دھندامند کر دیا ہے سائیں۔“ میں نے جھنجھلا کر اسے دھکارا۔ ”جابل انسان! تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔ میں کوئی پیر فقیر نہیں ہوں، اگر میری دعائیں اثر ہوتا، تو آج میں خودیوں بد در خواہ نہ ہوتا۔“ مگر خانو اس سے مس نہ ہوا۔ آخر کب تک ہم ظاہر پرست انسان بیرونی طبقے اور لباس کی بنیاد پر لوگوں کے ڈھدہ تقویٰ کا فیصلہ کرتے رہیں گے؟ سہرا اور داڑھی کے بے تحاشا بڑھے بال، چہرے اور لباس پر وقت کی دھول اور غم کی شکنیں، چادر پر درد کی ریلوئیں اور جھولی میں ناکامیوں کے ٹیکر اور کانٹے..... کیا کسی جو کی کا یہ حلیہ کافی ہوتا ہے، اُسے درویش ثابت کرنے کے لیے؟ میں نے جان بھجوانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ ”اگر تمہاری تسلی میری دعا سے ہوتی ہے، تو جاؤ میں نے تمہیں دعا دی۔“ خانو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر جانے کیا کہیں مانتا تھا وہاں سے ٹل گیا۔ میں نے تھک کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ان چھوٹے دیہات، قصبوں کے لوگ کہتے سادہ لوح ہوتے ہیں یا پھر شاید آج کا انسان اپنے غم کے ہاتھوں اس قدر ٹوٹا ہوا ہے کہ اُسے ہمیشہ کسی مسیحا کا انتظار رہتا ہے۔ کاش! انھیں کوئی سمجھا سکتا کہ میں مسیحا نہیں۔ اُن سے زیادہ دنیا داری کے داغوں سے قمارباز کا وہ مریض ہوں، جو خود ”خُٹائے عشق“ کی تلاش میں زمانوں سے بھٹک رہا ہے۔ یہ مشکل ایک دن سی ٹکون سے گزرا پایا اور اگلی صبح جب میں اپنے بخار سے تپتے جسم کو ایک بوسیدہ سے کبل میں پیٹنے درخت کے نیچے لیٹا تھا، تب ہی اچانک وہی بے وقوف خانو دور سے ہاتھ میں نہ جانے کیا کاغذ پکڑے، لہراتا شور مچاتا میرے قدموں سے آکر لپٹ گیا۔ ”تم واقعی اللہ لوک ہو سائیں! کمال کر دیا ایک ہی رات میں، جیو سائیں..... جیو۔“ میں نے جلدی سے اپنے چہرے لپٹ کر اسے دھکارا۔ ”ہنو پیچھے، یہ کیا کر رہے ہو؟“ خانو خوشی سے چلا یا۔ ”سائیں! یہ دیکھو، آپ کی دعا سے میرا اس ہزار کا پانڈ نکل آیا ہے۔ سارے ولڈز رُڈور ہو گئے، پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم میرے سائیں نہیں ہو۔ مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو۔“ کچھ ہی دیر میں آس پاس تمام ریلوے اسٹیشن کے محلے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی اور اگلے چند دنوں کے اندر میری زندگی میں نت نئے مذاہبوں کا ایک دور شروع ہو گیا۔ میرے ارد گرد قریب اور دور دراز کے سادہ لوح دیہاتیوں کا ایک بھوم جمع رہتا، جو میرے قدموں میں دس، بیس اور چھاس کے نوٹ نذرانے کے طور پر پھینک کر نہ جانے کون کون سی منگنیں پوری کرنے کی دعا میں مانگتے رہتے۔ میں جتنا ان لوگوں کو دھکارا تا اور قدموں میں پڑی اس ریزگاری کولات، بارش، آفتابی ان کی نظر میں معتبر تھیں۔ میرے بخار اور نقاہت نے مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ میں کسی رات منہ اندر میرے چپ چاپ وہاں سے کسی اور منزل کی جانب نکل جاؤں، لیکن میں جاتا بھی تو کہاں جاتا؟ ہر طرف اُسی انسان کا سامنا تھا مجھے۔ اور بھلا انسان سے بڑا امتحان اور کیا ہو گا اس جہانِ خراب میں۔ خانو مجھے اس بھیڑ کے ہاتھوں آزار میں مبتلا دیکھتا تو ڈاؤنٹ ڈپٹ کر لوگوں کو

وہاں سے ہٹا دیتا، مگر دو چار گھنٹے بعد پھر وہی جوم، پھر وہی بھانت بھانت کے انسان اور ان کی عجیب و غریب فرمائشیں، کوئی عورت ڈہائی دیتی۔ ”سائیں! میری بہو، بیٹا نہیں بنتی، چار لڑکیاں اوپر تلے سینے پر مونگ ڈل رہی ہیں، دعا کرو اس بار بیٹا ہو جائے۔“ کوئی دوسرا کہتا۔ ”بیٹے کو نو کری نہیں ملتی جو گی سائیں! بس، ایک نو کری ولادو۔“ تیسری جانب سے ایک اور آواز آتی۔ ”بس ایک ڈکان کا سوال ہے سائیں، کاروبار بنادو۔“ میں آنکھیں بند کیے منہ لپیٹے پڑا ہوا وہ میری خاموشی ہی کو میری دعا سمجھ کر کچھ دیر رونے دھونے کے بعد اٹھ کر چلے جاتے۔ اُن میں سے کوئی نہ جانے کب نکڑی کی ایک تختی پر خطی حروف میں ”آستانہ جو گی سائیں“ لکھوا کر لے آیا اور تختی کو درخت کے ایک اونچے حصے پر کیل سے لٹو تک گیا۔ وہ لوگ میری نقاہت اور بیماری کو میرا روزہ یا فائدہ سمجھتے تھے اور میری مردم بے زاری کو پوری فقیری کی نشانی، اوپر سے قدرت بھی عجیب طرح مہربان تھی۔ میرے ارد گرد موجود لوگوں کے ہتھکنڈے میں سے کسی نہ کسی کی خرابی آتی اور وہ اُسے میری ”کرامات“ کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ سو میں سے باقی اُن خانوے ناکام، خرابوں کو کوئی نہیں گنتا تھا، جو کبھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ کئی رات کے ٹھپ اندھیرے میں ایک معمولی دیا سلائی بھی دُور سے جلتی نظر آ جاتی ہے۔ آس پاس بکھری تاریکیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ وہاں سے چپ چاپ اٹھ کر کسی روز اسٹیشن سے گزرتی کسی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں دُور نکل جاؤں۔ ایک آدھ بار نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر سڑک پر بھی نکل آیا، مگر یہ جو گی سائیں کا لقب اور حلیہ آس پاس اور دُور دراز کے علاقوں میں میری کچھ ایسی پہچان بن چکا تھا، جیسے قیدی کے جیروں میں بیڑیاں یا کسی پیدا کی غلام کے ہاتھ پر گھدی کوئی سیاہ نمبر۔ میں جہاں بھی جاتا، میری بیٹانی پر بشت یہ غلام کی نمبر لوگوں کو میرے ارد گرد اکٹھا کر دیتی، میرا دم گھٹنے لگتا، میں گھبرا کر انہیں جھڑکتا، دُور ہٹاتا، وہ میرے اور قریب آتے اور تھک ہار کر میں واپس اُسی آستانے کی راہ لیتا، جہاں سے یہ نمبر ملای میری جبین پر کندہ کی گئی تھی۔ ایک آدھ بار کسی دیرانے کی راہ بھی اپنائی، مگر مجھ جیسے سیاہ بختوں کو دیرانہ بھی راس نہیں آتا۔ وہاں میری خبر زیادہ چیز سے پھیلتی اور پھر جمع ہوتی تعلقت کی وجہ سے اس دیرانے کی حرمت بھی مجروح ہو جاتی تھی۔ میں دنیا کو دھکارے دھکارے تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کسی عجیب ہے یہ دنیا، جب انسان اسے اپنا نا چاہتا ہے، یہ اسے دھکے دے کر دُور بھگاتی ہے، خوار کرتی ہے، ہر پل سسکا کر تپاتی ہے، مگر جب وہی انسان دنیا سے بے زار ہو کر اسے لات مارتا ہے اور کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے، تب یہی دنیا خود اس کے قدموں سے لپٹ کر منگنیں، ترلے کرتی ہے کہ اسے ٹھکرا کر نہ جائے۔ اور پھر مجھ جیسوں کا سفر بھی بھلا کیا سفر تھا، میرے لیے تو سب علاقے، جھجھکیں، لوگ، موسم اور روپے، سب ہی ایک جیسے تھے۔ کم از کم خانو والے ریلوے اسٹیشن پر میرے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک بھیس تو موجود تھا، ہذا مختلف علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد میں دوبارہ اسی جگہ پہنچ گیا، جس کی مفتی سے میرے اس نئے بہروپ کا خیر اٹھایا گیا تھا۔ مجھے واپس وہاں پا کر سارے اسٹیشن پر

جشن سا رہا ہو گیا۔ اُس اُسی بیٹھے خانو نے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ ”سائیں! کیا بتاؤں تم کو، جب سے تم روٹھ گئے ہو۔ سارا دھندامند ہو گیا ہے۔ سب پریشان ہیں، کہتے ہیں سائیں کی برکت اٹھ گئی ہے یہاں سے، اسی لیے کال پڑ گیا ہے، مگر اب یہ ویرانی دُور ہو جائے گی۔ بس سائیں، اب ہم سب کا بیڑہ پار ہے۔“ میں چپ چاپ بیٹھا اس بے وقوف داستانِ اعتبار پر دوسرے روز ہی علاقے کی ایک پرائی بند ٹرین پھر سے رواں کر دی گئی، جوم بے قابو سا ہو گیا۔ عجب مداری بنا کر رکھ دیا تھا اس تقدیر نے بھی۔

میں سارا دن سر جھکائے درخت تلے بیٹھا رہتا اور لوگ آتے جاتے رہتے۔ ایسی ہی ایک گرم دوپہر جب پرندے بھی آگ برساتے سورج سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانوں میں پڑ سیتے بیٹھے تھے، پلیٹ فارم پر اچانک اُچھل سی جگ مٹی۔ پتا چلا کہ علاقے کے سب سے بڑے زمین دار کی تیسری بیوی نے ڈھن اپنی خادماؤں اور خاص کارندوں کے فخر مٹ میں تشریف لائی ہیں۔ نوکرانیوں نے نذر نیاز کی پرامن میرے

قدموں میں رکھ دیں اور غلاموں نے ارد گرد لگی بجیلز کو جھڑک کر پرے جھکا دیا۔ لڑکی نوجوان بھی اور اس کو سب ”چھوٹی سرکار“ کے نام سے پکار رہے تھے۔ دو میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں سر جھٹکائے بیٹھا رہا۔ اس کی چوڑیاں نکلتیں۔ ”میرا نام گل ناز ہے جو گی سائیں..... رب کا یا سب کچھ ہے، پر گودا بھی عونی ہے۔ آپ کی ایک نظر چاہیے۔“ اس کی نرم دلائم آواز پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ اس مجھ کی طرح، اپنے نام کی طرح، جس پر پھول بھی رشک کریں، وہ گل ناز تھی۔ سُہری دکھتا رنگ، آنکھوں میں کاجل اور ناک میں سونے کا لونگ، سیاہ کڑھی ہوئی شال لپیٹے وہ خود گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ پل بھری میں مجھے اس کے حسین چہرے میں سب سے پہلے ناہید، پھر لبتی، لبتی، صباور یعنی کاچرہ جھکتا نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ”نہیں، اب اور نہیں..... بس..... عورت، چلی جا یہاں سے، جا، پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھانا مجھے۔“ گل ناز ڈر کر پیچھے ہٹی، تو خانو دُور سے بھاگتا ہوا آیا۔ ”جو گی سائیں جلال میں آگیا ہے چھوٹی سرکار۔ بس سمجھو، آپ کی مراد پوری ہوئی۔“ لڑکی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ ”اچھا؟ میں تو سمجھی کہ سائیں مجھ سے ناراض ہو گئے۔“ خانو نے بڑے دُعم سے جواب دیا۔ ”یہی تو بات ہے ہمارے سائیں کی۔ عورت اور پیسے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مگر آج تک جس کو بھی سائیں نے ڈانٹا، اس کی تپا ہر ہوئی۔“ گل ناز کچھ دیر مزید عقیدت سے ہاتھ جوڑے میرے قدموں میں بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے اٹھ کر خراماں خراماں واپس چلی گئی۔ اگلے چند دنوں میں چاروں طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ جو گی سائیں کو عورت اور خصوصاً خوب صورت عورت کے وجود ہی سے شدید نفرت ہے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ خُشن کا بکری زہر تو ہے، جو ازل سے میری رگ رگ میں سرایت کر کے میری نِروح کو تمام عمر ٹھسلا تار رہا ہے اور میں جل جل کر اتنی بار راکھ ہو چکا ہوں کہ اب کوئی پنچگری باقی نہیں رہی، پھر ایک دن ایک نوجوان جوڑا جھٹکے ہوئے میرے پاس آیا۔ لڑکی اور لڑکا دونوں کافی سبے ہوئے لگتے تھے۔ لڑکے نے بند ٹٹھی کھولی اور پچاس روپے کا نوٹ اتراسا نوٹ میرے قدموں میں ڈال دیا۔ ”ہمارے لیے دُعا کریں سائیں جی کہ ہماری شادی ہو جائے۔ ہم دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہمارا رشتہ ناممکن ہے۔“ میں نے ہنسوں کے اس جوڑے کی طرف دیکھا۔ ”صرف پچاس روپے میں شادی چاہتے ہو؟ اتنا سستا ہے تمہارا رشتہ.....؟“ لڑکا کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میرے پاس تو فی الحال بس اتنے ہی ہیں۔“ میں نے نوٹ پرے کر دیا۔ ”اتنے پیسوں میں جو گی سائیں شادی نہیں کر داتا۔“ لڑکے نے پریشان ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا، لڑکی نے جلدی سے اپنے کانوں میں پہنی سونے کی بالیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے یہ تم سے زیادہ محبت کرتی ہے، یہ بالیاں واپس اٹھاؤ لڑکی، محبت اگر بچی ہو تو بدست خود دنیا کی سب سے بڑی دُعا بن جاتی ہے۔ واپس چلے جاؤ تم دونوں اپنے گھروں کو۔ اور اس اُمید کے ساتھ جاؤ کہ تمہاری محبت ہی تمہاری دُعا ہے، تمہاری منت اور تمہارا تعویذ ہے۔“ دو دونوں یوں خوش باش اُٹھے، جیسے آج ہی ان کا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ اُن یہ محبت کرنے والوں کی ”ڈوڈ فہمیاں.....“ محبت کرنے والے ہمیشہ ایک

دوسرے کو پانے کی دُھن میں کیوں سرگرداں رہتے ہیں۔ کاش! یہ نادان جان پاتے کہ دنیا میں کسی کا محبوب ہونا ہی کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ محبت کو تو محبوبیت سے غرض ہونی چاہیے، نہ کہ وصل یا وصال سے۔ کسی کا محبوب ہونا کتنا بڑا عہدہ و مرتبہ ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ مجھ جیسے تو اپنی تمام غمراہی مسند پر ایک لمحہ بیٹھنے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اپنا سارا جیون جلا دیتے ہیں، مگر وہ پل بھر کے لیے بھی کسی کا محبوب نہیں بن پاتے۔ اور پھر میری طرح یہی ایک خواہش دل میں لیے ہمیشہ کے لیے خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

میرے خاک ہونے کے دن بھی قریب آ رہے تھے، میری حالت اب زیادہ تر اتر رہنے لگی تھی۔ مجھے دن، تاریخ، مینے اور سُن سے اب کوئی سروکار نہیں تھا، مگر دُور کھڑے خانو کے ٹھیلے پر بدلتے ریلوے کے لائنوں سے اتنا پتا چل جاتا تھا کہ مجھے گھر چھوڑے پانچ سال سے بھی کچھ ڈانڈ عرصہ ہو چکا تھا اور پھر موسم نے کروٹ بدلی اور جاڑے کی سردی اور کبرے نے ماحول پر اپنا سفید غلاف لپیٹ دیا۔ میں رات بھر گیلے کُلف تلے بارش میں بیٹھتا رہا اور نتیجہ اگلے روز صاف ظاہر تھا۔ خانو کسی کام سے مجھے اٹھانے آیا تو میرا ہاتھ ٹھوتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ”اوہو..... تمہیں تو جیز تاپ ہے سائیں۔ میں ابھی حکیم صاحب کو لے کر آتا ہوں۔“ خانو اُلٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ میں نے آواز دے کر اُسے روکنے کی کوشش کی کہ اب یہ روگ حکیم، طبیب یا دیدوں کے بس سے باہر کی بات ہے، ڈاکٹر اور طبیب مرض کا علاج کر سکتے ہیں، مریض کا نہیں۔ خاص طور پر جب مریض مجھ جیسا ہو کہ جسے خود اپنے فنا ہونے کا انتظار سب سے زیادہ ہو، میں نے خود کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے، مگر یہ زندگی بھی اس دو غلی دنیا جیسی ہی تھی، جو اس سے جان چھڑانا چاہے، یہ اسی کے دامن سے لپٹی رہتی ہے۔ خانو گھنٹہ بھر بعد ہی کسی بزرگ حکیم کی جڑی بوٹیوں سے بنی دواؤں کا بکھ ہاتھ میں تھامے دوبارہ نمودار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے میری نبض دیکھ کر تشویش سے سر ہلایا۔ خانو غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ حکیم نے چوڑے کے بکس میں سے چند صنوف نکالے اور ایک جا کر کے تین چار پُٹیاں سی بنادیں۔ ”یہ لو خانو میاں..... صبح، دوپہر، شام۔ دن میں تین تین مرتبہ ساوے پانی میں گھول کر پلائی ہے یہ دوا۔ سردی لگ گئی ہے تیرے سائیں کو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“ خانو نے کسی تجربہ کار اور مستند تیار دار کی طرح میرے طبیب کی ساری ہدایات اُتر کر لیں۔ شاید غالب نے خانو جیسے ہم دردوں کے لیے ہی کہا تھا کہ: ”پڑے گریہا..... کوئی نہ ہو بیمار دار“ مگر میرا بیمار دار کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ جو میں ساری خلقت کو دعامیں بانٹتا پھر تا ہوں، خود اپنے لیے شفا یابی کی دُعا کیوں نہیں کرتا۔ حکیم نے جاتے جاتے میرا شانہ چھتھپایا اور مُسکرا کر بولے ”فکر نہ کریں سائیں جی، جلدی بھلے چٹکے ہو جائیں گے۔“ میری زبان بے ساختہ پھسل پڑی۔ ”کچھ مزید تیار کرنے کی دوا بھی کرتے ہیں کیا آپ؟“ حکیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”نہیں، مجھے صرف شفا دینے کا حکم ہے۔ سو، اپنی ہی کوشش جاری رکھتا ہوں۔ مگر لگتا ہے، یہ ہنر آپ نے خوب سیکھ رکھا ہے، پر نقدیر سے لڑنے کا کچھ فائدہ نہیں سائیں جی، جو جتنی سانسیں لکھوا کر لایا ہے، اُسے اتنی جیتی ہیں۔ خود کو سزا دینا مناسب نہیں۔“ خانو حیرت سے میرے اور حکیم صاحب کے درمیان ہونے والے یہ مکالمہ سن رہا تھا۔ حکیم صاحب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ”دنیا کی ہر طب کا تعلق کسی نہ کسی طور انسان کے اعصاب اور اس کی شفا یابی کی خواہش سے ضرور ہوتا ہے۔ جینے کی خواہش اور صحت کی آرزو، بیمار عضو کے غلیوں کے دردازے، دوا کو اندر کشید کرنے کے لیے کھول دیتی ہے، ورنہ سب دوا میں ناکام و نامراد لوٹ جاتی ہیں۔ اپنے جینے کی کوئی وجہ پیدا کیجیے صاحب۔“ حکیم صاحب پلٹ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حکمت کا تعلق صرف علاج اور دوا داروں کے علم سے نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر جہاں تک لیڈا ہی اصل دانش و حکمت ہے۔ اس چھوٹے سے قہبے کا یہ حکیم بھی کچھ ایسا ہی دانا تھا، جو صرف انسان کی نبض ہی دیکھتا نہیں جانتا تھا، اُس نبض کی بولی بھی پڑھ سکتا تھا۔

خانو شہدہ سے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق میری بیمار داری میں بنارہا۔ تیسرے دن دُحول، بناشوں کے ساتھ ایک جھوم نذر اور نیاز کی دہلیں، سبز چادریں، سُہری غلاف اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ پہنچا۔ عقدہ کھلا کہ زمیں دار صاحب کی خدانے سن لی ہے اور ان کی گل ناز نے انہیں خوش خبری سنادی ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی ان کے آگن میں پھول کھلنے والا ہے۔ تھوڑی دیر میں جشن منانے والے یک دم خاموش اور مودب سے کھڑے ہو گئے۔ پتا چلا کہ زمیں دار صاحب خود تشریف لارہے ہیں۔ زمیں دار چچی غم کا ایک سخت گیر اور جہاں دیدہ محض دکھائی دیتا تھا۔ گل ناز بھی اُس کے ساتھ میرے قدم بوی کے لیے آئی تھی۔ اس نے دُور ہی

سے اشارہ کر کے اپنے سر کے اشارے سے سائیں کو میری نشان دہی کرا دی۔ زور میں دارمؤدب سا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ”میں پچھلے اس جھگڑے کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا سائیں جی۔۔۔۔۔ بچہ تو مرد کے نصیب سے ہوتا ہے، میں اسے ہمیشہ یہی سمجھا تا رہا، پر یہ ٹھپ ٹھپ کر چڑھوں فقیروں کے در پر مٹھیں مانگتی اور چڑھاوے چڑھاتی رہی، مگر اس کے نصیب کا چڑھاوا تو ہمیں اسی قصبے کے ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی ہماری یہ نذر نیاز قبول کرو۔ اور ہاں، آج کے بعد آپ کا تین وقت کا کھانا میری حویلی سے آیا کرے گا۔ خدا کے لیے انکار نہ کرتا۔“ میں نے سر جھکائے، شرمائی سی بیٹھی گل ناز کی طرف دیکھا۔ سارا اسٹیشن دُور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ مزید مشکلات منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی ہیں اور میرا ہاسبا تین اور سکون بھی غارت ہونے والا ہے۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید اس پلیٹ فارم پر نئے رہنماں کم زور عقیدہ لوگوں کو زیادہ بھگانے کا باعث ہو گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تنہائی بھی کسی کے لیے اتنی بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ کم نصیب اس کے لیے ترس ہی جائے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، جتنا میں تنہا رہنا چاہتا تھا، میرے گرد ہجوم اُسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔ رات گئے ایک مال گاڑی اسٹیشن پر گئی، تو میں نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا۔ پلیٹ فارم پر لگے گھڑیاں نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا اور میں دھیرے دھیرے رینگتی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ خانو سمیت سارا پلیٹ فارم چین کی نیند سو رہا تھا۔ میں ایک نسبتاً خالی بوگی میں فرش پر بکھرے خشک ٹھوسے پر خیمہ دراز ہو گیا۔

اگلی دوپہر کسی نے بوگی کا آہنی دروازہ سر کا یا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی ریلوے اہل کار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دُشت لہجے میں پوچھا۔ ”تم کون ہو، اور یہاں خالی بوگی میں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”فقیر ہوں، کلٹ کے پے سے نہیں تھے، اس لیے یہاں بیٹھ گیا۔ تم اپنا سامان دیکھ لو، میں نے کچھ نہیں اٹھایا۔“ ریلوے اہل کار کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا بادشاہ! پر آپ کو کہاں جانا ہے۔ یہ مال گاڑی تو اب ہفتہ بھر اسی جگہ پر کھڑی رہے گی۔ کوئی خدمت ہو ہمارے لائق تو بتاؤ۔“ ”نہیں، تمہاری مہربانی۔ میں یہیں اُتر جاتا ہوں۔“ میں چپ چاپ گاڑی سے اتر کر ایک طرف ہو لیا۔ ریلوے اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ شاید یہاں گاڑیوں کا گزر کم ہی ہوتا ہو گا، سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مجھے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک بڑا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا، لہذا اس بار میں نے پلیٹ فارم پر ڈیرہ بنانے کے بجائے، قصبے سے دُور جاتی ایک گچھنڈی کی راہ لی۔ سارا راستہ سنگڑ اور کانٹوں سے آنا پڑا تھا اور دُور دُور تک سبزے کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں خشک پڑی تھیں اور راستے بھر دُھول اُڑتی رہی۔ عجیب قحط سالی کی سی کیفیت طاری تھی۔ سارے علاقے میں، میں نے ایک خشک ہوتے جوڑے سے پرے ڈیرہ جانے کا فیصلہ کیا، جہاں ایک بوڑھے درخت کی بے تحاشا پھیلی ہوئی شاخوں اور جڑوں نے ایک مسکن بنا رکھا تھا۔ شام ہونے سے پہلے میں نے آس پاس کی تھوڑی سی جگہ سے سنگڑ اور کانٹے ہٹا کر اپنے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین صاف کر لی، لیکن اس ذرا سی مشقت ہی نے مجھے مڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں وہیں درخت سے ٹیک لگا کر سستا رہا تھا کہ دُور سے ایک بوڑھا شخص سائیکل پر کسی بچے کو بٹھائے خرماں خرماں پیڈل مارتا میرے قریب سے گزرا اور پھر آگے جا کر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دوبارہ میری طرف پلٹا۔ میں نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہی آدم زاد.....؟ بوڑھے نے میرے قریب آ کر اچھی طرح میرا جائزہ لیا۔ میں نے چپ رہنے ہی میں مافیت جانی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا ”اس علاقے میں نئے آئے گتے ہو جی..... میرا نام مہر دین ہے، اور یہ میرا پوتا ہے کمالا۔ کوئی روٹی کھرچا ہے ہو تو بتاؤ جی۔ میں اس علاقے کا ڈاکا کیا ہوں۔“ میں نے دُور کھڑی مرغ سائیکل کے پیچے سے کھینچے بچے پر نظر ڈالی۔ ”نہیں میرے پاس جھولے میں کچھ چنے اور غلڑ موجود ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے۔“ بوڑھے مہر دین پر میری کرشمگی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ آس پاس میلوں دُور تک چھیلی بگڑوے آب زمین کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا۔ ”صاف پانی کا بڑا کال ہے یہاں۔ انسان اور جانور، بندے اور ڈنگر سارے اسی جوڑے سے پانی پیتے ہیں۔ برسوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں برسا یہاں پر۔ میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے ایک صراجی صاف پانی لادوں تمہیں۔“ بوڑھا ٹھکڑا ہوا۔ ”چل کمالے! تیری ماں راہ دیکھتی ہو گی۔“ مہر دین اپنی سائیکل کی طرف جاتے جاتے دوپل کے لیے رُکا۔ ”جو اگر وہ سائیں لوگوں کی دُعا میں برا اثر ہوتا ہے، ہمارے علاقے کے لیے بھی دوپل پڑھ دینا، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔“ میں خاموش رہا۔ مہر دین نے ایک لمبی سی غنڈی آدھری اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے ٹنگوں کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ مگر ٹنگوں بھلا کب لکھا تھا، کھنے والے نے میری قسمت میں۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ زور کا میند برسا کہ ہر طرف غل کھل ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے شور مٹا اٹھا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو مہر دین ایک جھوم کی قیادت کرتا، میری جانب دوڑا چلا آ رہا تھا۔

(جاری ہے)

باہم نہیم جو ان نسل کے پسندیدہ، نلک کے معروف و منفرد اماراتر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا سہر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سندے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہنا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رفلوں، بدینیت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا ہاؤس پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سندے میگزین“، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

خلیل جبران نے کہا تھا ”جب کبھی میں نے صبر کی زمین میں اپنے درد کا پودا سینچا“ بدلے میں اس نے مجھے خوشی کا پھل دیا۔“ مگر شاید میرے نصیب میں صرف درد، غم اور پریشانی کے تناور درخت ہی لکھے تھے۔ مہر دین اور اس شور مچاتے جہوم کی صورت میں ایک نئی مصیبت میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی۔ بارش کی بو چھاڑتیز تر اور ان سب کے نعروں کا شور ہنگامہ خیز تھا۔ پاؤں میں پرانے چمیل اور نعروں پر ناکانی اور چھید بھری برائے نام چھتریاں، دوسب میرے قریب پہنچے تو میرے پھرے ہوئے تیر و تیکہ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک ہمارے درمیان صرف برستی بوندوں کی بولی مترنم کے فرائض سرانجام دیتی رہی، مگر دنیا کا سب سے مشکل کام شاید خاموش رہنا ہے۔ سو ان سب کو بھی یہ خاموشی گھسنے لگی اور پھر مہر دین ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور ہلکے سے کھٹک کر بولا ”یہ سب یہاں ہمارا شکر یہ ادا کرنے آئے ہیں سائیں لو کو..... میں تو کل ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اپنے اس خبر اور خشک علاقے کی قسمت بھی گھسنے والی ہے“ مگر تم نے تو ایک رات ہی میں کرشمہ کر دکھایا۔“ میں نے درشت لہجے میں ان سب کو دھککا رہا۔ ”یہ بوڑھا مہر دین دیوانہ ہو گیا ہے شاید..... اور تم سب بھی بڑے بدحوہ ہو“ جو اس کی باتوں میں آ کر یہاں چلے آئے ہو.....؟ بارشیں اپنے وقت ہی پر برستی ہیں، چاہے آسمان کے بادلوں کی ہوں یا پھر نصیب کی ”جاؤ جا کر پانی ذخیرہ کرنے کی کوئی تدبیر کرو“ ورنہ پھر سالوں تک پانی کو ترستے رہو گے۔“ چنانہیں! انہیں میری بات کتنی سمجھ آئی اور کتنی رائیگاں گئی، مگر ان میں سے کچھ بزرگ اور کچھ ٹٹے ٹٹے کے چند لوگ آگے بڑھے، کسی نے چادر، کسی نے چاول، ٹٹے اور پنکھوں سے بھرے بھولے میرے سامنے خالی کر دیے، کوئی جیب میں چند گتے بھر کر لایا تھا، تو کسی نے دودھ سے بھری گلدوی میرے سامنے دھری۔ مہر دین رو پڑا۔ ”ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے سائیں لو کو! اسے قبول کر لو اور وعدہ کرو“ اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ ہمارا سایہ بن کر سبیل ڈیرہ ڈالے رہو گے۔“ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان لوگوں کو مزید سمجھانے کا فائدہ تھا، اس لئے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس برستی بارش سے لڑ پڑوں انسان اپنے ظاہری دشمن سے جنگ لڑ سکتا ہے، اسے برا کر شکست دے سکتا ہے۔ اپنی ”فتح“ جیت سکتا ہے، مگر مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔ سو، مقدر کے ہاتھوں زخمی ہو کر میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھا بیٹھتا رہا، پر..... کچھ بارشیں صرف بغیر دھرتی کو سیراب کرنے کے لیے ہی برستی ہیں، جو دل کے سنگھے آنگن کو بھٹکے، ایسا سا دن میری قسمت میں بھلا کب تھا؟ اگلے روز مہر دین میرے پاس آیا، تو میں نے سختی سے اسے منع کیا کہ اگر اس کی ہستی والوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا تو اس پاس کے علاقوں میں اس اتفاق بارش کا خواہ مخواہ چرچا کیا، تو میں چپ چاپ یہاں سے اٹھ کر کسی اور جانب نکل جاؤں گا۔ مہر دین نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگا یا اور قسم کھائی کہ وہ ایسا ”گناہ“ کرے گا نہ کسی اور کو کرنے دے گا۔

میرے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا؟ کسی نئی ہستی یا جنگل کی جانب نکلنے سے پہلے کچھ دن یہاں بتانا اب ناگزیر لگنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بار یہ جو گی سائیں کا لقب اور ان بھولے لوگوں کی یہ ضیف الاعتقادی کا بت ہمیشہ کے لیے توڑ کر ہی آگے بڑھوں گا۔ مہر دین نے میری دھمکی شاید بہت مؤثر انداز میں ہستی کے لوگوں تک پہنچادی تھی، اسی لیے چند دن سکون رہا۔ البتہ عصر کے بعد مغرب تک کے وقفے میں اگاؤ کا خضرورت مند مجھ سے کچھ فاصلے پر دور چمکنا پڑی پراٹھتے اور دُور ہی سے دُعا کی التجا کر کے داہیں پلٹ جاتے۔ انسان اور دُعا کا بھی کتنا پڑا، کیسا ازلی، ابدی رشتہ ہے۔ جانے کائنات میں دُعا پہلے وارد ہوئی ہو گی یا انسان؟ میں دن بھر خود کو یہاں وہاں الجھائے رکھنے کی کوشش میں کسی نہ کسی طور صبح سے شام تو کر لیتا تھا، مگر شام ڈھلتے ہی اس کی یادیں کالی رات کے سایوں کی طرح مجھے گھیر لیتی تھیں۔ جانے وہ کیسی ہو گی۔ داہیں آ کر اس نے دوبارہ اپنا ریڈیو پر وگرام شروع کیا ہو گا کہ نہیں؟ اب وہ کیسی دیکھتی ہو گی؟ کچھ چروں کا حسن صرف ضرب کھانا جانتا ہے، کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ وہ بھی دُعا کی دل کش اور حسین ہو چکی ہو گی۔ کاش! دنیا کے کسی جزا کے پاس تو وہ دفتر ہوتا، جو ایک ہی چر کے میں ہمارے سارے جسم سے ان یادوں کا سارا زہر نکال بیٹھتا۔

اگلے روز مہر دین کے ساتھ ایک دوسرا بوڑھا بھی کھٹکارتے ہوئے، عصر کے بعد میرے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ ”یہ ٹھکڑا دین ہے سائیں لو کو..... اپنا ٹھکڑا..... اس کی نواہی کو بڑے زور کا بخار ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دو تو دُعا کے لیے اسے یہاں لے آئیں۔“ میں نے ناگوار سی سے مہر دین کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ”میں نے اسے بہت سمجھایا ہے سائیں، پر یہ بھلا میری بات سمجھتا نہیں، کہتا ہے سائیں سے روبرو دُعا کی درخواست کر دو کیجو۔ بڑا مجبور ہے بے چارہ۔ اس کی سکینہ کو جن آتے ہیں جناب۔ دُور کی دُعا سے وہ شیطان بھلا کہاں جان چھوڑیں گے اس کی۔“ میں نے جان ٹھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ میں دُعا کر دوں گا، اگر تم دن تک لڑ کی کی طبیعت نہ سنیں، تو اسے لے آنا۔ ان دُور دراز کے علاقوں میں جوان لڑکیوں کو مختلف گھریلو اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے ہسٹریا کے یاد گیر نفسیاتی دورے پڑتے رہتے ہیں، جن کا دورانیہ چند گھنٹوں کا ہو تا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ٹھکڑے کی نواہی بھی ایک آدھ دن میں بھلی چٹکی ہو جائے گی، مگر ہمیشہ کی طرح میری یہ خوش فہمی بھی تیسرے دن ہی دور ہو گئی۔ جب ٹھکڑا ایسا چادر میں لپیٹی گم ضمیر سی ایک لڑکی کو لے کر میرے ٹھکانے پر پہنچا۔ میں خود اپنے ہی الفاظ کے جال میں پھنس چکا تھا۔

سو، بادل نخواستہ کھاوے کے طور پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ گلابی شام کے ڈھلنے سورج کی کرن سے سکینہ کے ناک کا لونگک پل بھر کے لیے چکا تو ایک لمحے کے لیے میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی۔ اُف..... کس قدر ویران آنکھیں تھیں۔ کسی برباد شہر کی طرح جس کا سب کچھ ٹوٹ کر، جاتے ہوئے لیرے تیل چھڑک کر آگ بھی لگا گئے ہوں۔ کچھ ایسا ہی دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا مجھے سکینہ کی ان جلتی آنکھوں سے۔ شگور اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ ”کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ہنسی بولتی تھی، ساری سکینوں سمیت پورے گاؤں میں اودھم مچاتی پھرتی تھی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا، ان کی شیطانیوں سے، بانگوں میں ٹھوٹے ٹھوٹے تھیں، ایک گھر کی چھت سے دوسری چھت تک کہ کڑے لگاتی پھرتی تھی یہ پھر نہ جانے کیا ہوا، رفتہ رفتہ اسے چپ لگتی گئی، ساری ہنسی اور قہقہے کھو گئے اور یہ ایسی ہو گئی۔ اس کی نانی کہتی ہے کہ وہ اسی لیے ان لڑکیوں کو شام ڈھلنے کے بعد ویران ٹھکڑوں پر جانے سے منع کرتی تھی۔ ضرور کسی ویران درخت تلے بیٹھے بیٹھے اسے کوئی جن چٹ گیا ہے۔ بس سائیں جی، اب تمہاری دُعا کا سراپا کچھ ایسا بڑھ کر چھوٹو کہ میری سکینہ پھر سے پہلے جھنسی ہو جائے۔“ اس تمام عرصے میں، سکینہ ہم دونوں سے لائق سی بیٹھی، کچی زمین پر ایک تنکے کی مدد سے لکیریں بناتی اور مٹاتی رہی، دُھلتی شام میں، اس کے چہرے کی پیلانٹ نے آس پاس کے ماحول میں سروسوں کی بکھیر رکھی تھی۔ میں نے بنا کچھ کہے چپ چاپ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ میری دیکھا دیکھی پہلے شگور سے اور پھر سکینہ نے بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھا دیے۔ خود اپنے لیے دُعا مانگتی مجھے وہ بہت معصوم لگی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شگور سے کہا، ”اسے کسی اچھے حکیم یا طبیب کو دکھاؤ، ہو سکے تو شہر لے جا کر کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ، دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔“ شگور نے آہ بھری ”آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں جی، پر یہ بگلی کسی کی سنتی کب ہے، میں نے شہر چلنے کا کہا تو صاف انکار کر دیا، اس نے، کہتی ہے، اس کا جو ہوتا ہے، اُدھر ہی ہوتا ہے۔“ میں نے غور سے سکینہ کی طرف دیکھا ”کیوں لڑکی! کیوں تنگ کرتی ہو اپنے بزرگوں کو۔ بات کیوں نہیں مان لیتی ان کی.....؟“ سکینہ میری ڈانٹ سے گھبراہٹ ہو گئی ”جی..... وہ.....“ مجھے لگا کہ اپنے نانا کی وجہ سے وہ ٹھل کر بات نہیں کر پارہی تھی، سر جھکا کر بس اتنا ہی بول پائی ”ٹھیک ہے جی..... آپ کہتے ہو تو مان لوں گی۔“ شگور اخوش ہو گیا ”دیکھا سائیں! میں جانتا تھا اس کا علاج تمہارے پاس ہی ملے گا۔“ شگور اسکینہ کو ساتھ لیے واپس پلٹ گیا، مگر نہ جانے کیوں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے سکینہ کی ویران خالی سیاد بڑی بڑی آنکھیں اپنے آس پاس ہی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ سورج کی زردی شب کی سیاہی میں تبدیل ہوئی تو رات کا چاند سکینہ کے چہرے کا سورج ٹنگھی لیے آسمان پر دوبارہ نمودار ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اُس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا وہ کرب، کیسا تھا؟

اگلی صبح مہر دین تازہ پانی کی صراحی لایا تو اس نے خود ہی شگور سے کا ذکر، چھیڑ دیا۔ ”کل سے ذرا سکون ہے، نیناڑوں کے گھر میں، کبھی ہنسی بولتی چڑیا سی تھی بے چاری سکینہ، اب تو جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے اس کے۔“ میں نے مہر دین کی طرف دیکھا۔ ”اچانک ایسا کیا ہو گیا اسے..... اور اس کی یہ حالت کب سے ہے؟“ ”تین سال ہو گئے ہیں سرکار، بہت علاج کروایا، بڑے پھیرے لگائے ہیں شگور سے نے

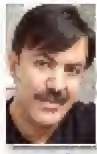
آس پاس کی ساری بستیوں کے، کوئی مزار کوئی درگاہ نہیں چھوڑی، جہاں اس نے دُعا نہ کی ہو، علاقے کے سارے وید، حکیم اور طبیب بھی تھک کر بہت ہار چکے ہیں۔ کسی نے شگور سے کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے لاکی کو لے کر کسی دور دراز کی ہستی چلا جائے، شاید ماحول بدلے سے کچھ بہتری ہو، مگر یہ طریقہ بھی بے فائدہ رہا۔ آخر کار، شگور سے کو واپس لوٹنا ہی پڑا۔ ابھی چند دن پہلے، جس رات تمہاری دُعا سے علاقے میں بارش برسی تھی اس سے ایک رات پہلے ہی تو شگور واپس لوٹا تھا اپنی سکینہ کو لے کر۔“ میں نے بے خیالی میں مہر دین سے پوچھا ”کہاں لے گیا تھا شگور دین اپنی نواسی کو؟“ ”شگر گڑھ، وہیں ریلوے پلیٹ فارم کے قریب ہی گھر ہے اس کے دادا کا۔“ میں چونک سا گیا، یہ تو وہی علاقہ تھا جس کے پلیٹ فارم پر خانو کا کینن واقع تھا۔ ”کتنا عرصہ رہی وہاں سکینہ؟“ ”لگ بھگ چھ ماہ، مگر وہاں بھی اس جھلنی کا شن نہیں لگا۔ بس دن بھر بیٹھی آسمان کو کھتی رہتی تھی۔“ پھر کچھ سوچ کر مہر دین خود ہی اُداس ہو گیا ”اور پتا ہے سائیں جی! کبھی کبھی تو بالکل جو گٹوں جیسی حرکتیں کرتی ہے، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔“ مہر دین کی باتیں سن کر میرے اندر کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ میں نے مہر دین سے کہا کہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے شگور سے کو میرے پاس بھیج دے۔ سر شام ہی شگور سکینہ سمیت آ گیا۔ ”حکم سائیں۔“ ”سکینہ کیسی ہے اب؟“ ”شگور دین نے گھر اسانس لیا، پہلے سے کچھ بہتر ہے سائیں! ایک آدھ دن میں شہر کی بڑی ڈاکٹرنی کو بھی دکھانے لے جاؤں گا۔ سکینہ کے باپ کو بھیجا ہے میں نے شہر ڈاکٹرنی کا پتا لگانے اور وقت لینے کے لیے۔“ میں نے اپنے اندر ابھرتے ایک عجیب سے موبوہم خدشے کی تصدیق چاہی۔ ”جب تم سکینہ کو دوسری ہستی لے گئے تھے ماحول بدلنے کے لیے، تب وہاں اس کا میل جول کن لوگوں کے ساتھ تھا؟“ ”شگور نے تاسف بھرے لہجے میں سکینہ کی حالت زار بیان کی ”وہ کب کسی سے ملتی ہے سائیں جی! وہاں بھی سارا دن گم ضم بیٹھی رہتی تھی۔“ سکینہ اس وقت بھی ہم دونوں کی باتوں سے لائق سی بیٹھی زمین پر تنکے کی مدد سے اپنا پسندیدہ کھیل کھیل رہی تھی۔ اتنے میں گاؤں سے ایک کچی عمر کا جوڑا آ کر ہم سے کچھ دور فاصلے پر بیٹھ گیا۔ عورت کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ مرد نے مٹت کی ”سائیں جی! ہمارا چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے۔ چار بہنوں کا اکوٹا بھائی ہے۔ دُعا کرو کہ ٹھیک ہو جائے۔ بڑا تیز بیمار ہے اسے تین دن سے۔“ میرا جی چاہا کہ میں انہیں بڑی طرح دھتکار دوں۔ میں نے مرد کو ہچکاڑا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے یہاں کیوں آ گیا ہے؟ مرد نے بتایا کہ وہ کافی علاج کروا چکا ہے، مگر بچے کی حالت نہیں سدھ رہی۔ تنکے کی مدد سے زمین پر لکیریں کھینچتی سکینہ نے دھیرے سے خود کلائی کی ”ٹھیک ہو جائے گا صبح تک رب کی مرضی سے، بس آج کی رات کی سختی ہے۔“ شگور گاؤں سے آئے ہوئے جوڑے سے بات چیت میں مصروف تھا، اس لیے میرے علاوہ کسی نے بھی سکینہ کی یہ

سرگوشی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے وہ خود اپنے آپ سے بڑبڑا رہی ہو۔ نہیں جانتا تھا کہ عورت اور مرد دعا لیے بنا وہاں سے نہیں ملیں گے۔ لہذا حسب معمول میں نے اپنے سدا کے خالی ہاتھوں کا شکول ہوا میں بلند کر لیا۔ اس جوڑے کے جانے کے بعد شکور اور سکینہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ شکور نے جاتے جاتے بتایا کہ اگر شہر میں بات بن گئی تو وہ سکینہ کو کل ہی شہر لے جائے گا۔ میرے اندر کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا سربستہ راز اپنے قفل کھولنے کو بے تاب ہو، مگر میں اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی گنجی کہیں کھو بیٹھا ہوں۔

اگلی صبح سورج کچھ زیادہ ہی ناراض سا نمودار ہوا اور اپنا غصہ، جھلکتی کرنوں کی صورت، بن سایہ جان داروں پر برسائے لگا۔ دوپہر سے پہلے ہی گزشتہ روز والا مرد بھاگتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں گر گیا۔ ”میرے کا کے کا بخارا اتر گیا ہے سائیں جی، کل رات تو ہم کبھے تھے کہ بس جان لے کر ہی چھوڑے گئے۔ بخارا اس کی۔ بڑا ترپا ہے ساری رات ہسپر جیسے کوئی مچھلی بن پانی کے تڑپتی ہے۔ بچ بتاؤں سائیں، میں تو امید چھوڑ بیٹھا تھا، مگر پھر تمہاری دعا نے فجر کے بعد ایسا اثر دکھایا کہ سورج نکلنے تک میرا ہکا بھلا چنگا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب تمہاری کرامت ہے سائیں۔ سارے تمہاری دعا کے کرشمے اور برکتیں ہیں۔ قربان جاؤں میں اپنے سوہنے رب کے، اُس نے تمہیں ہم غریبوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے، اُس بستی میں۔“ وجوش میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، مگر میرے تو سارے الفاظ ہی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کل ہی میرے سامنے سکینہ نے یہ سرگوشی کی تھی کہ شکور سے کاچڑ رات بھر کی سختی کے بعد صبح شفا یافتہ ہو جائے گا اور اس کی کہی ہوئی بات ہو ہو ٹھیک ہوئی تھی، یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اور پھر میرے ذہن میں بچے کے بعد دیگرے جھماکے ہوتے گئے، سکینہ بھی اسی دن واپس اپنی بستی پہنچی تھی، جس دن میں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا اور پھر اسی رات اس علاقے میں برسوں بعد بارش برسی تھی۔ دوسرا جھماکا ہوا، اور مجھے مہر دین کی بات یاد آئی کہ سکینہ کا نانا سکینہ کو ماحول کی تبدیلی کے لیے اسی قصبے میں لے گیا تھا، جہاں ریلوے پلیٹ فارم پر میرا ٹھکانہ تھا۔ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر ٹھٹھٹھنے لگا۔ جہاں جہاں قدرت نے میری دعا کی لاج رکھی تھی، وہاں اُس پاس سکینہ کی موجودگی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت سکینہ کے گھر چلا جاؤں، مگر لوگ میری اس حرکت کا نہ جانے کیا مطلب لیتے، میں دو چار قدم بڑھ کر واپس پلٹ آیا۔ اتنے میں دور چنگڑی پر سورج کی قہر برساتی دھوپ کی گرمی سے جتنی زمین سے اشقی سراب کی لہروں میں مجھے شکور سے کاہنہ لادھیرے دھیرے لائٹنی ٹپکتا، شہر کی جانب جاتی بڑی سڑک کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے غرٹھ کائے گھڑی سی بنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ضرور وہ سکینہ ہی ہو گی۔ ایسے موقعوں پر انسان کے دل اور زبان سے ہمیشہ کچھ اس قسم کے غیر تفکرانہ فقرے ادا ہوتے ہیں کہ ”کاش! اس وقت کچھ اور مانگ لیتا، تو خدا وہ بھی ضرور دے دیتا“، مگر ہم انسان بھی کتنے بھولے ہیں۔ بھلا اس لمحے کسی کو کچھ اور مانگنے کا خیال ہی کب آتا ہے۔ ہمیں ٹھیک قبولیت کے لمحے قدرت جو عطا کرتی ہے، ہم اسی پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں اس لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اس لمحے شکور اور سکینہ ہی اپنی ہر چاہت، ہر دعا کا بدلہ نظر آرہے تھے۔ شکور میرے قریب پہنچا تو گرمی کی وجہ سے بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ ”شہر کی بڑی ڈاکٹرئی سے بات ہو گئی ہے سائیں جی..... اس نیماڑی کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ اس کے باپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارا حکم نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ دعا کرنا ہمارے لیے۔ اگر بس وقت پر مل گئی تو رات تک وہی ہو گی، ورنہ کل تیری خدمت میں حاضری دوں گا۔“

سکینہ حسب معمول غرٹھ کائے کھڑی تھی۔ میں نے شکور سے کو دو لمحے درخت کے نیچے سستانے کا اشارہ کیا۔ سکینہ نے خود کو سمیٹا اور اپنے کم زور اور مضطرب وجود کو شکور سے پیچھے چھپا لیا۔ شکور نے سوائی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی ”کچھ دیر سستا لو، شاید شہر جانے کی ضرورت نہ رہے اب، تم شکر گڑھ کے اسٹیشن پر کھو کھا لگنے والے خانو کو جاننے ہو؟“ شکور نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”ہاں جی..... وہ میرے داماد کا بھائی ہے۔ وہیں ریلوے اسٹیشن کے باہری تو کوارٹر ہے میری نیابتا میں کا۔“ اور اس علاقے کا چوہدری.....؟ کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہے تمہاری یا سکینہ کی؟“ ”نہیں جی براہ راست تو ملاقات نہیں ہوئی، ہاں ایک آدھ بار میں جب سکینہ کو لے کر ریاست پور کی بڑی درگاؤ پر دعا کے لیے گیا تھا تب وہاں چوہدری صاحب بھی اپنی گھر والی کے ساتھ دعا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہیں دعا کرتے دیکھا تھا انھیں۔“ اب میرے پاس مزید شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے شکور سے کو ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور براہ راست سکینہ کی طرف دیکھا، وہ میری نظروں کی کاٹ سے گھبرا کر مزید سٹ گئی، میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی ”کون ہو تم.....؟“

(جاری ہے)



.....باشم ندیم.....

باشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سٹوڈنٹ میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھاپ ہے، جسے کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے ان گنت بد صورت رہنوں، بد حیثیت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا ہمدردی پر اتنا ہے:

ایڈیٹر، ”سٹوڈنٹ میگزین“، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر ٹیکر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا سوال عن کر سکینہ سے زیادہ شکورے کے چہرے پر حیرت اور تعجب کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ سکینہ نے گھبرا کر اپنے ناناکے طرف دیکھا جیسے اس سے اپنی شناخت کی تصدیق چاہتی ہو۔ شکورے نے گڑبڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کی ”سائیں یہ میری نواسی.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر شکورے کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”سکینہ کو جواب دینے دو“ سکینہ مزید بول کھلا گئی ”وہ جی..... میں..... میں تو بس سکینہ ہوں۔“ ”نہیں تم وہ نہیں جو“ نظر آتی ہو۔ ساری دنیا کو دعائیں دیتی پھرتی ہو۔ ان کے لیے رب سے مانگتی ہو پھر خود کو اس جو گن کے بجیس میں کیوں ڈھال رکھا ہے؟ کیوں فقیر بنی پھرتی ہو؟ کیوں خود کو اور اپنے گھر والوں کو اس عذاب میں ڈال رکھا ہے؟ بولو، بولتی کیوں نہیں.....؟“ شکورامیرے غصے بھرے لہجے کو میرا جلال سمجھ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکینہ بالکل روپا نہی ہو گئی اور اس نے خود کو شکورے کی اوٹ میں پھپھایا پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید غصے میں میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا تھا۔ یہ لڑکیاں جانے کس ریٹیم کی بنی ہوئی ہیں، لہجوں کی تیز دھار سے بھی کٹ کٹ جاتی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شکورے سے کہا کہ فی الحال وہ واپس اپنے گھر چلا جائے، جب ضرورت ہوئی تو میں خود اسے بلاؤں گا۔ شکورے کا دل وہاں سے اٹھ کر جانے کو نہیں تھا، مگر میرے لہجے کی سختی نے اسے بادل ٹھوسا اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سکینہ بھی پچپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔ اس کی گھبراہٹ اور آنکھوں میں اٹھنے والے سوالوں سے ایک بات تو مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ خود اسے بھی اپنی ان دعاؤں کی قبولیت کی کرامت کا کوئی علم نہیں۔ ساری بات مجھ پر دھیرے دھیرے گھٹنے لگی تھی ”جانے یہ اتفاق تھا یا میری تقدیر کا ایک اور مذاق“ مگر کچھ کہتا تھا کہ خانو والے پلیٹ فارم سے جہاں میرے ماتھے پر جو گی سائیں کی ٹیبر لگی تھی، ہر اس جگہ کے آس پاس سکینہ موجود رہی تھی ”جہاں لوگ میری دعا کی قبولیت کے لیے جھکتے رہے تھے اور آج تک ان سب بچوں پر خانو سمیت جس ضرورت مند کی دعا بھی قبول ہوئی“ دراصل وہ سکینہ کی دعا کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا۔ قدرت یہ سب میرے کھاتے میں ڈالتی رہی اور سیدھے سادے لوگ میرے مزید بٹنے چلے گئے۔ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلا کہ ان کی یہ دعائیں ایک نڈھال اور لاغری لڑکی کی سفارش کے بدلے قبولیت کا رنگ لاتی ہیں۔ اگلے ایک دو روز میں، میں نے باتوں باتوں میں شکورے سے ان سب باتوں کی تصدیق بھی کر لی۔ خانو کی بیوی اپنے ہمسایوں کے سامنے ہر لمحہ خانو کی غریبی اور اپنی معاشی مشکلات کا دردناک و رتی رتی حق اور خانو کا بانڈ گھٹنے سے پہلے بھی وہ کئی بار سکینہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اگر خانو کا بانڈ گھل جائے، تو ان کے دن پھر جائیں گے ”ٹھیک اسی طرح سارے گاؤں کو پتا تھا کہ چوہدرانی کو اولاد کی خواہش ہے“ جیسے اس علاقے کے لوگ ہارش کی تمنا میں نڈھال تھے، مگر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ کتنا پریشان کیا تھا مجھے اس جو گی سائیں کے لقب نے ”لوگوں کو سکینہ کی اصلیت کا پتا کیوں نہیں چلا؟ لوگ تو درکنار خود سکینہ بھی اپنے آپ سے ناواقف نظر آتی تھی ہمارے معاشرے میں لوگ ہمیشہ سائیں ”بابوں اور جو گیوں ہی کو اپنا آٹری سمجھا کیوں سمجھتے ہیں“ کوئی ساہنڈ، جو گن یا بی بی ان کی نظر میں ڈکھوں کی مسیحا کیوں ثابت نہیں ہوتی؟ سچ کہتے ہیں یہ دنیا مردنے اپنی جاگیر سمجھ رکھی ہے۔ کوئی رجبہ، کوئی عہدہ، کوئی نشست بھی تو خالی نہیں چھوڑی۔ اس نے حوا کی بیٹی کے لیے، مگر ایک سوال خود میرے اندر بھی کھسی سنبولے کی طرح کبابلا رہا تھا۔ سکینہ کو یہ اعزاز کب اور کیسے حاصل ہوا۔ کون سی ریاضت ایسی تھی، جو اسے اس مقام پر لے آئی تھی۔

اگلی شام علاقے سے خانہ بدوشوں کی ایک ٹولی کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرے ڈیرے سے کچھ پڑے اپنے خیمے گاڑ لیے اور شب بسر کے لیے آگ کا لالہ روشن کر لیا۔ ان کے دو بڑے میرے پاس اجازت لینے آئے کہ اگر مجھے ناگوار خاطر نہ ہو تو ان کا معمول رات دیر گئے تک صوفیانہ کلام اور کافیاں گانے کا ہے، میں اب انہیں کیا بتاتا کہ کبھی میرے گھر اور گاڑی میں ہر لمحہ یہ کلام نہجا کرتا تھا۔ موسیقی کا ہماری زندگی سے کچھ عجیب سا رشتہ ہے۔ ہم کبھی اسے مذہب کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کبھی دل کی خاطر اپنا لیتے ہیں۔ حرام اور حلال کی تقسیم میں دنیا کے بڑے بڑے گوئیے اس آت سے جان بچھڑانے کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت میں اس سے دوبارہ جڑ جاتے ہیں۔ کچھ خود کو نعتیہ اور حمد یہ کلام تک محدود کر لیتے ہیں، کچھ صرف صوفیانہ کلام کی نئے پکڑ لیتے ہیں، گویا جھگڑا سڑ سے نہیں سنگیت سے ہے۔ ”لے کا نہیں، صرف تال کا ہے۔ میں جب دینی میں تھا، تو میں نے بہت خوب صورت اور ضربی اذان سنی تھی۔ یہی حال میرا آجین کی مسجد کے ایک مؤذن کی خوش الحانی سن کر بھی ہوا تھا۔ ایسی آواز کہ قدم جکڑ کر رکھ دے۔ انسان خود بہ خود دعوت دینے والے کی جانب بڑھ جائے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت دینی کے ایک رمضان کی تراویح میں سورہ رحمان کی تلاوت سن کر ہوئی تھی میری، شاید کچھ خوش الحانیوں کا تعلق ہماری روح کے کچھ دھانگوں، خمیر کے کچھ ریٹوں سے بھی جڑا ہوتا ہے ”خانہ بدوش قبیلے کا وہ خوش الحان بھی بہت شریلا تھا۔ بابا بیسے شاہ کا کلام گڈوی کی تھاپ پر رات کی خاموشی میں سر تکھیر رہا تھا۔

چا دس دے دلبر مای نوں
میکوں یار بھلایا جاندا نہیں
سر رکھ کے یاروے قدمیں دج
سر فیر اٹھایا جاندا نہیں
میرا دل اک اے میری جان اک اے
میرا دین اک میرا ایمان اک اے
جدوں رب رسول قرآن اک اے
دوچا یار بنایا جاندا نہیں

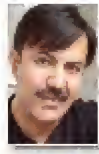
کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گھما گھل روح ہمیشہ جانتی ہے کہ اس کے رستے زخموں کا مرہم کیا ہے، مسئلہ صرف دماغ کو منانے کا ہے

کہ دل اور دماغ کی یہ ازلی جنگ ہم مجبور 'کم زور اور بے بس انسانوں کو سدا و حصوں میں تقسیم رکھتی ہے' ہم دین کے ہو پاتے ہیں نہ دنیا کے 'مجھ جیسے پری زاد بن جاتے ہیں، میں اک ہمارا، جس کے لیے نہ کبھی زمین مہرباں رہی نہ آسمان۔ جانے کیا سوچ کر میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے' تب ہی میرے قریب سے ایک ملائم سی آواز ابھری 'آپ رورہے ہو سائیں جی.....؟' میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں 'سکینہ جانے کب سے میرے قریب کچھ قدم کے فاصلے پر آئی تھی۔ میں نے حیرت سے اس پاس نظر ڈالی، ہنسی کے بہت سے گھرانے خانہ بدوشوں کے بگ راتے میں شریک ہونے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر مہر دین 'اور شکور ابھی بیٹھے سر ڈھٹے نظر آئے۔' 'ہاں..... کچھ یاد کر کے آکھ بھرا آئی، تمہاری آنکھیں بھی تو بر لہ چمکنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ کیا غم ہے تمہیں؟ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے بتا سکتی ہو۔' سکینہ سر جھکائے بیٹھی رہی 'شکور نے آٹھ کر میری طرف آنے کی کوشش کی، تو مہر دین نے اسے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بندھا دیا اور جانے اس کے کان میں کیا کہا۔ شاید مہر دین بھی سمجھ گیا تھا کہ سکینہ کبھی اپنے ہاتھ کے سامنے ٹھکل کر زبان نہیں کھولے گی۔ سکینہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا 'کچھ نہیں ہوا ہے مجھے سائیں جی۔ میرے گھروالے تو بس ایسے ہی بلکان ہو رہے ہیں۔ خود ہی زل ٹھکل کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے.....؟' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا 'پھر ایک دم دنیا کیوں تباہ دی تم نے' جو گمن کیوں بن گئی ہو.....؟' سکینہ نے بل بھر کے لیے نظریں اغما میں 'جو گ تو آپ نے بھی لے رکھا ہے سائیں جی..... آپ نے بھی کوئی روگ لگا رکھا ہے کیا.....؟' میں نے چونک کر سکینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک سوال ہی میں، میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی کتنا کم فہم اور نادان تھا۔ اتنے سامنے کی بات سمجھنے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی تھی 'دنیا کے ہر جوگ کے پیچھے یہی اک محبت کا روگ ہی تو چھپا ہوتا ہے' یہی عشق کا فرما رہا ہے 'ہر عذاب کے در پردہ' اسی پیار کے نشتر کی کاٹ کا داغ ملتا ہے، ہر زخم کے پس منظر میں۔ محبت ہمیں سائیں بنادیتی ہے 'جو گی کے روپ میں ڈھال دیتی ہے' فقیر کے بہروپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ سکینہ کی کہانی بھی اسی محبت کے مارے بد نصیبوں میں سے ایک کی داستان تھی۔ تین سال پہلے جب وہ مکمل زندہ دلو کی تھی 'جس کا دل بارش کی پہلی ہوند کے ساتھ ہی جھولا ڈالنے کے لیے چمکنے لگتا تھا' ہوا کی سرگوشیاں جس کے دل کو گدگداتی تھیں 'لہ بھر کے لیے ٹھہرے ہادل کا سایہ، جسے دن بھر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔ تب ایسی ہی ایک کالی رات، جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ برف بھری ٹو کریوں میں باغ سے آم پڑا کر جمع کر رہی تھی، تب ہی اسے علاقے کے ایک گہرو، سانول نے دیکھ لیا۔ سانول علاقے کے نمبردار کا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا بیٹا تھا، جو شہر کی یونیورسٹی سے ایم اے لسانیات کی ڈگری لے کر آیا تھا اور اس ایک پہلی نظر نے ہی ان دونوں کا کام تمام کر کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، چاند ستاروں پر کند ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی 'کیوں کہ وہاں انسان کے قدم پہنچ چکے ہیں۔ صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ ہر کسی کو ہر لمحہ، ہر رابطہ میسر ہے۔ مشین ہماری زندگی پر حاوی ہو چکی ہے۔ محبت کی روایتی داستانوں کو لوگ گزرے دنوں کا قصہ کہتے ہیں۔ ہیرا پنجا، سستی بنوں، سوہنی مینوال اور شیریں فرہاد 'الف لیلیٰ کی کہانیاں لگتی ہیں۔ محبت ڈیکھیل ہونے لگی ہے۔ انسان عروج کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہے 'مگر یہ پہلی نظر..... یہ آج بھی اپنے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات چھپائے بیٹھی ہے۔ کوئی سائنس دان آج تک اس پہلی نظر کے ڈنک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا۔ کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا' نظر کے زہر کا آج تک۔ ہر خرابی کی جڑ یہی ایک پہلی نظر ہی تو ہے۔ نئے زمانے کے نئے لوگ لا کھ انکار کریں 'لا کھ مذاق اڑائیں' 'مگر کج یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چوٹی دا من کا ساتھ ہے۔ پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور ہماری زندگیوں میں وارد ہو جائے، یہی معاملہ سکینہ اور سانول کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں ایک بار ملے اور پھر ملتے ہی گئے۔ مگر ظالم زمانے کو بھلا یہ ملاپ کب بھاتا ہے 'سناج سدا سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ سو' یہاں بھی وہی ہوا۔ علاقے کے کسی بندے نے سکینہ کو سانول سے ملتے ہوئے دیکھ لیا 'بات پھیل گئی۔ سانول باقاعدہ رشتہ لے کر اپنے گھر والوں سمیت سکینہ کے گھر جانا چاہتا تھا، مگر اس کے نمبردار باپ کی اتنا ایک مزاح کے گھر رشتہ لے جانے کے آدھے آگئی 'ویسے بھی علاقے کا پٹواری اپنی بیٹی رضیہ کو سانول کے سنگ رخصت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور نمبردار بھی پٹواری کے گھر رشتہ کرنے کا خواہاں تھا۔ رنجو شکل و صورت میں بھی چندے آفتاب، چندے ہاتھاب تھی 'اور اس کے خوابوں میں بھی نہ جانے کب سے سانول بس رہا تھا۔ وہ تو اس کی یونیورسٹی کی ٹیچنوں کی دعا میں لگتی پھرتی تھی، تاکہ اس کے دل مگر کا شیزادہ وہاں گھر لوٹ سکے 'مگر جب اسے پتا چلا کہ سانول اور سکینہ کی کہانیاں ریاست پور کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں 'تو اس کے سینے پر یہ یک وقت کتنی سانپ لوٹ گئے 'جانے یہ محبت کی کہانیاں اتنی جلدی سارے زمانے میں کیوں اور کیسے پھیل جاتی ہیں؟ اور نہ ہر دوسری آفت کے گزر بھی جائے 'ہم اس کی تباہی سے آخری وقت تک بے خبر رہتے ہیں۔ رضیہ جیسے لاڈ سے سارے گھر والے رنجو کہتے تھے 'اس لیے بھی بے چین تھی کہ اسے یقین تھا کہ ہنسی بھر میں صرف وہی ایک سانول کے جوڑ کی ہے 'اس کے حسن کے چاند کے سامنے بھلا کسی اور کے روپ کا چراغ کیا جلیے گا' مگر اس نے جو سوچا تھا 'سب اس کے الٹ ہو رہا تھا۔ یہ معمولی سے کتنی کمین گھرانے کی سکینہ کہاں اس کے سپنوں کی تجوری پر ڈاکا ڈالنے آگئی تھی۔ رنجو کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح سکینہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اسے ٹھہر بھر کے لیے داغ دار کر دے۔ جانے علاقے کے سب سے وجہ نوجوان کو اس کے اندر کیا نظر آتا تھا؟ یہ رقیب بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں 'جانے دنیا میں محبت پہلے اتنی تھی یا قابت؟ رقیب ہر لمحہ اپنے حریف کی سانس بند کر دینے کی فکر میں لگتا رہتا ہے۔ رنجو کا بھی یہی حال تھا، اور پھر آخر کار اس کے دل کی فراور آئی۔ سانول کی ماں نے اس کے سامنے اپنا دو پٹا ڈال دیا اور بہنوں نے اپنی چادریں پھیلا دیں کہ ان کی محبت اور مان کی خاطر وہ رنجو سے بیاہ کے لیے ہاں کر دے۔ دنیا میں چور اور ڈاکو دوسروں کے گھر دہلیز میں بڑے بڑے ڈاکے ڈالتے ہیں 'مگر اس جہاں کا سب سے بڑا ڈاکہ یہ رشتوں کا ڈاکا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ماں باپ 'بہن بھائی اپنی محبتوں اور خد متوں کی ڈھائی دے کر کسی اپنے ہی چہیتے کی محبت لوٹ کر مارتے ہیں۔ سانول بھی باپ کی ضد 'ماں کے آنسوؤں اور بہنوں کی آہوں کے سامنے آخر کار مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی ہی محبت کا خرمن جلا ڈالا 'کہتے ہیں ریاست پور کی بڑی باراتوں میں سے ایک بارات تھی نمبردار کے بیٹے کی۔ سانول کی بیٹی کا چڑھی 'سکینہ کے دل کا دریا بھیڑ سے لیے اتر گیا۔

شادی سے ایک رات پہلے سانول آخری بار سکینہ سے ملنے آیا۔ اس نے سکینہ کو اپنے دل کی حالت بتائی اور مجبور یوں کی ساری داستان بیان کی کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کی محبت کا اتنا متروض ہے کہ جس کے سودے کے طور پر ان دونوں کو اپنی محبت ٹھہر کے لیے گروی رکھنی پڑے گی۔ سکینہ پچ رہی۔ محبت میں عورت اپنی مجبوری بیان کرے تو اس

پر دنیا بڑے سخت الزامات لگاتی ہے۔ بے وفائی کے طعنے اور سنگ دلی کے طنز کیے جاتے ہیں۔ تیروں سے عورت کا سینہ چھلی کر دیا جاتا ہے، مگر مرد جب محبت میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہے، تو اسے اپنے رشتوں کا وفادار، زمانہ شناس اور مخلص کہا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کے گھن گائے جاتے ہیں اور زمانہ اسے اپنی چٹکوں پر بٹھاتا ہے۔ سانول بھی رنجو کی چٹکوں کی ڈولی چڑھ گیا، سارا گاؤں ان دونوں کی خوب صورت اور جھلی جوڑی دیکھنے کے لیے آندا آیا تھا۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دونوں کو بس قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ہی تراشا تھا۔ دلوں کے حال تو خدا بہتر جانتا ہے، مگر کہنے والے کہتے تھے کہ سانول اور رنجو کی نظر ایک دوسرے سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھی۔ رنجو نے جب شادی کی رات سانول کے گھر میں پہلا قدم رکھا، تب ہی سے سانول کی ماں، بہنیں رنجو پر صدقے واری جاری تھیں۔ نصف شب تک ریمیں چلتی رہیں اور ماں بہنوں نے اپنے ویر شہزادے کی بارات کا ہر ارمان جی بھر کے پورا کیا۔ سارا محلہ سانول کے گھر کی طرف سے آنے والی شہنائیوں کی آواز اور دخول بتاؤں کی دھمک سے رات بھر گونجتا رہا۔ ان کے قہقہوں کی آواز سکینہ کے گھر کے آگھن تک بھی آرہی تھی۔ سکینہ کا دل کبھی نہ پھٹتا اگر ان ہنسی کی آوازوں میں خود اس کے اپنے محبوب کی آواز شامل نہ ہوتی۔ اس درد کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے، جس نے زندگی میں کبھی خود محبت کی ہو۔ مگر کیسے چھلی ہوتا ہے اور سینے سے جلنے دل کا دھواں کیسے نکلتا ہے، جب اپنا ہی سانول کسی اور سانول کی کے ساتھ چپ عروسی منارہا ہو۔ سکینہ کے اندر بھی کچھ ایسا شور مچا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اور پھر اسے ایسی چپ گئی کہ لوگ اس کی آواز سننے کو بھی ترس گئے۔ جسم کے اندر بیٹا خون سو کھٹا چلا گیا۔ ہونٹوں سے مسکان کا رشتہ کچھ ایسے ٹوٹا کہ وہ سدا کے لیے مسکرا نہای بھول گئی۔ محبت جب انسان کی شریانوں اور ہنسی ٹسوں میں خون کے ساتھ دوڑتی ہو، تب وہی محبت روٹھ جانے پر، لہو کی روانی روک بھی دیتی ہے۔ خون صرف بہہ کر ہی خشک نہیں ہوتا، کبھی کبھی ٹسوں کے اندر بھی اپنا بہاؤ کھو بیٹھتا ہے۔ محبت کا مریض دن بہ دن لاغر اور کم زور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے طبیب اس کے مرض کی شناخت ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں، مگر مرض کا سرا نہیں ملتا، مریض سو کھ کر کاٹا ہوتا ہے اور یہ ظاہر پرست حکیم اور دیکھ اس کھوج میں گھلتے رہتے ہیں کہ آخر ہنا کوئی چوٹ لگے، ہنا کسی بیماری کے، اس مریض کا وزن دن بہ دن کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ گالوں کی طرف پیلاہٹ میں کیوں بدل رہی ہے، جسم کی شادابی خشک ہوتے پٹے کی طرح رخصت کیوں ہو رہی ہے۔ سکینہ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا اور پھر تین چار ماہ کے اندر اندر وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گئی۔ اس کا محبوب اپنی نئی دنیا میں گھن گیا، ایک آدھ بار قبے کے بازار یا کسی درگاہ، مزار پر سکینہ کا سامنا ہوا بھی، تو وہ نظریں پڑا گیا، یا شاید وہ سکینہ کو پہچان ہی نہ پایا ہو۔ یہ تو وہ سکینہ تھی ہی نہیں، جو کبھی اس کے دل کی رانی تھی۔ سکینہ بس سانول کو دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی کتنا بانگا اور بھلا تھا اس کا محبوب، مگر رنجو کو کسی نوکرانی کی زبانی اس نگرانی کی خبر ملی، تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے سانول اب بھی ٹھپ ٹھپ کر سکینہ سے ملتا ہے۔ رقیب ہمیشہ رقیب ہی رہتا ہے۔ محبوب کا درجہ پانے کے بعد بھی اس کے اندر پلٹے سدا کے شکوک و شبہات کبھی اسے اس اعزاز کا حق دار نہیں بنے دیتے۔ رقیب نے چوں کہ خود کسی کی محبت پر ڈاکا مارا ہوتا ہے، اس لیے وہ ساری زندگی خود ایسی کسی چوری سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس کی نیندیں اپنے خزانے کی حفاظت کی فکر میں اڑی رہتی ہیں۔ جلن اور حسد کے سانپ اسے ہمیشہ ڈستے رہتے ہیں۔ رنجو بھی کسی ایسی ہی تیش کا شکار تھی۔ وہ یہ بات نہیں بھولی تھی کہ کبھی سانول سکینہ پر مرتا تھا۔ دونوں کی محبت کے ہر سوچے چپے تھے۔ کون جانے کب سانول کے دل میں پھر سے پرانی محبوب کی محبت جاگ اٹھے۔ رنجو سوچ سوچ کر ہلکا ہو گئی، تو پھر آخر کار اسے وہ خوف ناک فیصلہ کرنا ہی پڑا، جو صرف ایک رقیب ہی کر سکتا ہے۔ خا کر دینے کا فیصلہ، جو محبت کرتے ہیں وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں اور جو رقیب ہوتے ہیں، وہ دوسروں کو مار کر اپنی محبت کی بقا ڈھونڈتے ہیں۔ رنجو نے علاقے کی نیاز کی رسم کے مطابق منوں دودھ خرید کر ساری ہستی میں تقسیم کر دیا۔ البتہ اس بانٹ میں بس ایک فرق تھا۔ سکینہ کے گھر جو دودھ کی منگی بھیجی گئی تھی، اس کے اندر علاقے کے سب سے زہریلے سانپ کا زہر حاصل کر کے چند بوندیں اس دودھ میں ملا دی گئی تھیں۔ سکینہ کی ماں نے پیتل کی منگی سے دودھ نکال کر کنواری سکینہ کے سامنے رکھ دی۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”ہدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سندھ میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے کم صورتی کے عیب کے حب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت ریلوں، بدویت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈ سے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر ٹیکر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماں چاہتی تھی، اس کی مریض لاڈلی کے بے رونق چہرے پر کچھ رنگ آجائے، شاید اس تازہ اور ٹھنڈے دودھ کی تاثیر ہی سے کچھ پل کے لیے اس کی نڈھال سی ڈھاری تو ان کی محسوس کرے۔ سکینے نے دودھ کی کنوری اٹھا کر منہ سے لگائی ہی تھی کہ باہر سے اس کے بوڑھے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دی، مگر دوسری آواز سن کر تو جیسے اس کی پوری کی پوری روح ہی جھنجھٹا گئی۔ یہ تو سانول کی آواز تھی۔ ہاں..... اسی سانول کی جس کی محبت نے اس کی روح کے ریٹے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔ سکینے کے ہاتھ میں کنوری کچھ ایسے لرزی کہ سارا دودھ کپڑوں پر چھلک گیا۔ سکینے نے کنوری نیچے رکھ دی اور خود پردے کی اوٹ سے باہر ہونے والی بات چیت سننے لگی۔ پتا چلا کہ سانول کسی کام سے سکینے کی گلی سے گزر رہا تھا کہ سکینے کے باپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پرائی باتوں اور یادوں کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ بگھے ٹھکڑے زبان تک آ گئے۔ سانول نے سکینے کے باپ کو یقین دلایا کہ وہ آج بھی خود کو ان کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتا ہے، مگر سکینے کا باپ ابند ہو گیا کہ اب ملاقات ہو ہی گئی ہے، تو دو گھڑی اس کے گھر کے صحن میں بیٹھ کر انہیں عزت بخشے۔ سانول نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی، مگر اس کی ایک نہ چلی۔ سکینے کی ماں جو دل ہی دل میں ہمیشہ ہی سانول کو اپنے دادا کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی، اُسے گھر میں پا کر ایک بار پھر اپنی ناکام آرزو کا غم لیے سانول کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں اور کچھ تو تھا نہیں پیش کرنے کے لیے، رنجو کے گھر سے آئی دودھ کی مٹکی ہی میں سے ایک کنوری نکال کر سانول کو تھما دی، جو اس نے ایک سانس میں طاق سے نیچے اتاری اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ سکینے کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا، مگر سانول دروازے تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ لا کھڑا کر دیں مگر گیا۔ سارے گھر میں جھونپال سا آ گیا، سبھی سانول کی جانب لپکے، سکینے بھی ساری لالچ شرم بھلا کر دروازے کی جانب دوڑی۔ سانول کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر نے زمین پر گھل گھیر دیا تھا۔ سانول اور سکینے کی نظر آخری بار ٹکرائی، اُن دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی تھی۔ سانول کو کچھ کہنے اور سکینے کو کچھ سننے کی مہلت ہی نہ ملی اور سانول نے وہیں سکینے کے سامنے دم توڑ دیا۔ ایک قیامت آ گئی، سکینے پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ سکینے کے باپ اور گھر کے باقی مردوں کو علاقے کی پولیس قتل کے الزام میں دھر کر لے گئی۔

رنجو کو جب سانول کی موت کا پتا چلا، تو اس نے لمبے بھری میں صحن میں اپنے کنوئیں کی منڈر ٹاپ کر گھرائی میں چھلانگ لگادی۔ خوش قسمتی سے گھر کی نوکرانی نے بروقت اطلاع کر دی اور رنجو کو زندہ کنوئیں سے نکال لیا گیا، مگر وہ زندہ کب تھی۔ نہ جانے سانس کی روانی اور دل کے دھڑکنے کو زندگی کا نام کیوں دے دیتے ہیں لوگ.....! سات دن بعد رنجو کا سکتہ ٹوٹا تو وہ پہلی بار ٹوٹ کر روئی۔ اسے پتا چلا کہ سکینے کے گھر والوں نے جلن اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے، سانول کو دودھ میں زہر ملا کر مارا۔ ساری ہمتی یہی سمجھتی تھی کہ یہ حرکت سکینے کی ہو سکتی ہے، جس پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے گھر والوں نے خود کو قربانی کے بکرے کے طور پر پولیس کے حوالے کر دیا، تو رنجو نے اپنی عذت کی پردا بھی نہیں کی اور سیاہ چادر اوڑھ کر سکینے کے گھر پہنچ گئی۔ سکینے اور رنجو کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھتی رہیں اور پھر رنجو یوں لپک کر سکینے کے سینے سے جا لگی، جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں۔ دونوں کچھ ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ مانوسیا ب آ گیا۔ صرف وہ دونوں ہی دنیا میں ایسی تھیں، جو ایک دوسرے کے دل کا درد سمجھ سکتی تھیں۔ اُن دونوں کا محبوب اُن سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی رقیب تھیں، مگر رقیب سے زیادہ محبت کے بچھڑنے کا ڈکھ بھلا کون جانتا ہے۔ یہاں محاورے نا نہیں حقیقت دونوں کا غم ایک تھا۔ صرف وہی دونوں اس کرب کی کاٹ اور جان لیوا غلاب سے واقف تھیں۔ رنجو نے پولیس کو اپنا چچا بیان ریکارڈ کروادیا۔ سکینے کے گھر والے رہا ہو گئے اور رنجو سلاخوں کے پیچھے چلی گئی، مگر اس محبت کی بھٹی نے سکینے کو کچھ ایسا جلایا کہ وہ سب کرسمس ہو گئی۔ ایک ایسا پارسی بن گئی، جس سے چھو کر لوہا تو لوہا، مٹی بھی سونا بنی گئی۔ اسے شاید یہ اعزاز اس لیے ملا کہ اس نے خود اپنے لیے دیاترک کر چھوڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جب بھی اٹھے یا اس کے لب جب بھی کھلے، صرف اور دل کے لیے ہی کھلے، خود اپنے لیے کچھ بچا ہی کب تھا کہ دہا لگتی۔ شاید ہم جب کسی دوسرے کے لیے اپنے خدا سے کچھ مانگتے ہیں، تب ہم خلوص، عاجزی اور بندگی کی اس معراج پر ہوتے ہیں، جو دنیا کی ہر دُعا کی قبولیت کا آخری پیمانہ ہے۔

نصف شب ڈھل چکی تھی۔ خانہ بدوش بخاروں کا جلا جلا ہوا والا سرد پڑ گیا تھا۔ بخارے نے آخری تان لگائی اور مغلغل برخواست کر دی۔ جانے اُس لمبے پھر مجھے شدت سے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں خود بھی تو ایک بخارہ ہوں اور وہ مجسمہ ساز کسی چاند نگر کی شہزادی تھی۔ بخاروں کی پہنچ شہزادیوں تک بھلا کب ہوتی ہے۔ مٹی کے کھلونوں کے بدلے روپ کا سونا کون بیچتا ہے؟ روپ کے سودے صرف روپ کے بدلے ہوتے ہیں اور جو بھی جیسے بے روپ، بد صورت ہوتے ہیں، اُن کے ہاتھ صرف خاک ہی آتی ہے، خاک کے بدلے خاک! شگورا اور مردین سکینے کو لے کر واپس جانے لگے، تو میں نے شگورے سے کہا۔ ”اتنا کچھ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا، پھر بھی تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری نواہی منے ہو لے اور پھر سے غام زندگی بن جے.....؟“ شگورا اثر مند گی کے مارے سر جھکائے کھڑا رہا۔ مردین نے اس کی مدد کی۔ ”یہ ساری بھلا جانے کی باتیں ہیں سائیں جی! اثر مند گی ہی اثر مند گی ہے اور پھر تم سے کون سی بات ٹھہری ہے سائیں! یہ

نہاڑاں تو بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کی سکینہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ڈولی چڑھ کر اپنے لاڑے کے ساتھ رخصت ہو جائے، اس کا بچن گھر بار ہو، بال بچے ہوں، یہ باتیں سب کے سامنے کہنے والی تو نہیں ہیں ناں سائیں جی.....! بس تم دعا کرو دو ہماری سکینہ کے لیے۔“ میں نے سر ٹھکائے کھڑی سکینہ پر ایک نظر ڈالی۔ ”یہ مجھ جیسے برائے نام اور دکھاوے کے سائیں بابوں کی دُعا سے بہت آگے جا چکی ہے مہر دین! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کی خوشی اور اس کے غم کے معیار اس دنیا کی روایت سے بہت جدا ہیں، اگر تم دونوں اس کی خوشی چاہتے ہو، تو اس سے کہو کہ خود اپنے لیے خوش حالی اور اچھے گھر بار کی دعا کرے، یہ اگر مان گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ اسے زیادہ ٹنگ نہ کرنا۔ یہ جس حال میں خوش رہے، تم سب اسی کی خوشی میں خوش رہنا۔“ مہر دین اور شکور اسر جھکائے چپ چاپ سکینہ کو دہاں سے لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر ہی میں صبح کا اُجلا پھیلنے لگا۔ سورے سے اُٹھ گئی اور انگڑائی سے زندہ کی جانے کا استعارہ جوڑ دیا گیا ہے۔ سکینہ کی ہستی بھی انگڑائی لے کر جاگ اُٹھی، گھروں سے مرنوں کی باتیں اور چھتوں کی چھینوں سے زندہ کی نوید دیتا دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ ان سارے دیہات، قصبوں اور بستیوں کی صبح ایک جیسی ہوتی ہے، شہروں کی طرح ایک جھٹکے سے نہیں، بلکہ دھیرے دھیرے جاگنے والی، سرکئی، پچھلی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ ہستی کے دروہام اور آنگنوں میں اترنے والی.....! میں نے کسی گزرتے راہ گیر سے سانول کی قبر کا پتا پچھا اور قبرستان جا کر فاتحہ پڑھ آیا۔ قبر کے قریب کچی زمین پر مجھے بہت سی آڑی تر چھی لکیریں کھینچی نظر آئیں، ویسی ہی لکیریں جیسی سکینہ نے میرے ڈیرے کی زمین پر کھینچ رکھی تھیں۔ میرا ہی چاہا کہ میں ساری ہستی کو اکٹھا کر کے انہیں یہ نوید سنا دوں کہ اب انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے کسی فقیر یا مجذوب کی حمایت کی ضرورت نہیں، وہ روہاتھ، جھیلیوں کا چاند تو خود ان کی ہستی کے ایک کچے گھر میں روشن ہے، مگر یہ سدا کے تو ہم پرست لوگ بھلا میری بات پر کہاں یقین کریں گے، ہاں اگر سکینہ کسی چوہدری، وڈیرے یا نمبردار کی بیٹی ہوتی، تو یہی لوگ آنکھیں بند کر کے میرے ہر جھوٹ پر بھی یقین کر لیتے اور اس وقت تک سکینہ کی حویلی کے باہر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ چکی ہوتی۔ میں آج تک کبھی یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہم انسان دُعا کی قبولیت کے لیے اپنے جیسے زندہ یا مردہ انسانوں کی سفارش یا وسیلہ کیوں ڈھونڈتے ہیں، ہم اپنے رب سے براہ راست کچھ مانگتے ہوئے اتنا جھٹکتے اور شرماتے کیوں ہیں؟ یہ کیسی بے یقینی ہے ہمارے اندر، یا شاید یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے، مگر مایوسی کو تو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے بے یقین بھی اپنے اعتبار کے کافر ہیں.....؟

ڈیرے پر واپس پہنچنے سے پہلے میں یہ طے کر چکا تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا کہ میں اب اس دُھوم جگ کا بو جھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا۔ واپس آ کر میں نے دو گھڑی سستانے کے لیے کمر لگائی ہی تھی کہ مہر دین کا پوتا اپنی چھوٹی سی سرخ سائیکل دوڑاتے، ہاپتا ہوا ہاں پہنچا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”سب خیر تو ہے کا کے.....؟“ بچے نے مجھے چاروں طرف گھوم پھر کر یوں دیکھا جیسے تسلی کر رہا ہو کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں!“ کچھ نہیں سائیں جی! داوے نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو سائیں جی ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں..... بس اب میں چلا۔“ وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی تیز تیز پیڈل چلاتے دہاں سے بھاگ گیا۔ یہ بچے بھی اپنی دنیا میں رہنے والے مست ملگ ہی ہوتے ہیں، اپنی مزید خودی جانتے ہیں۔ جانے مہر دین نے اسے کس کام سے بھیجا تھا اور وہ کیا سمجھا تھا، مگر دوپہر ڈھلتے ہی مہر دین خود بھی شکورے کے ساتھ ہڑ بڑایا ہوا سادہاں آن پہنچا۔ اُن دونوں کے چہرے پر لکھی پریشانی کی لکیریں دُور سے پڑھی جاسکتی تھیں۔ ”سائیں جی! سب خیری صلا ہے ناں.....؟““ہاں میں ٹھیک ہوں مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو.....؟“ ان دونوں سے کوئی بات ٹھیک سے بڑ نہیں پائی۔ ”وہی سکینہ نے آج صبح یہاں سے واپس جا کر تمہارے لیے بہت برا استفادہ کیا ہے۔“ میں ہنس پڑا۔ ”بس اتنی سی بات ہے، تم دونوں سکینہ کے بڑے پتنے سے گھبرا کر یہاں دوڑے چلے آئے..... میری زندگی پہلے ہی کسی بڑے خواب سے کم نہیں ہے، جاؤ جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے لیے فکر مند نہ ہوا کرو تم لوگ.....! کچھ نہیں ہو گا مجھے!“ لیکن میری اس بے فکری کا اُن دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکور ابولا۔ ”بات اتنی سادی نہیں ہے جی! سکینہ کے خواب بچے ہوتے ہیں سارے..... جب سے سانول کی موت ہوئی ہے، اس کا کوئی خواب جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔“ میں نے ان دونوں کو تسلی دی۔ ”مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں ہو، آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے خواب میں.....! میرے پاس کھونے کے لیے اب باقی کچھ نہیں بچا ہے۔“ شکورے نے گہری سانس لی۔ ”سائیں جی! اب میں کیا بتاؤں تمہیں، میری تو زبان غلطی ہے بولتے ہوئے، سکینہ نے خدا نخواستہ تمہاری موت دیکھی ہے..... اس نے خواب میں دیکھا کہ ہمارا سائیں فوت ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے لیے کفن دفن کا انتظام کر رہے ہیں۔“ مہر دین نے شکورے کو سختی سے گھورا اور شکورہ گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں کافی دیر میرے قریب بیٹھے رہے، جیسے انہیں خوف ہو کہ ان کے جاتے ہی مجھے کچھ ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ سکینہ کے ہر خواب کی تعبیر تب سے سچی ہوتی ہے، جب سے سکینہ خود ایک خواب رفتہ جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جب شام گہری ہونے لگی، تو میں نے انہیں زبردستی واپس بھیج دیا، ورنہ ان دونوں کا ارادہ اٹھنے کا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ڈھلا تو میرے دل کے اندھیرے بھی میرے ارد گرد رقص کرنے لگے۔ چلو اچھا ہوا، سکینہ نے مجھے میرا انجام کچھ پہلے ہی بتا دیا، ورنہ خود میں اس انجام کے لیے ہمیشہ سے تیار تھا، کہانی ختم ہونے کا وقت آپہنچا تھا۔ میں خود بھی بہت تھک چکا تھا اس بھاگ دوڑ سے، اب لمبی نیند سونے کو تھی

چاہتا تھا۔ رات دھلی تو میں نے یہی سوچ کر آنکھیں موند لیں کہ اب یہ آنکھیں شاید کبھی نہ کھلیں، مگر حشر تک کی نیند شاید ابھی میرا مقدر نہیں تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اک نئی صبح کی نوید لے کر آئی تھی، مگر میری آنکھ کھلنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دُور سڑک کے کنارے ایک بڑی امپورنڈ گاڑی کا بوٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور سمیت ایک دوسرا شخص بوٹ پر ٹھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسنے میں ایک تیسرا محافظ نما شخص قریبی جوڑے پانی کا ایک کین بھر کر لایا اور ڈرائیور نے پانی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں ڈال دیا۔ میں نے بے زاری سے چہرہ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں، مگر پھر اچانک ایک مانوس سی آواز نے میرے وجود میں بجلیاں سی بھر دیں۔ وہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ ”اور کتنا دیر لگے گا تم بھلا..... سارا دن لگائے گا کیا.....؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بوٹ پر ٹھکا ہوا دوسرا شخص کبیر خان تھا۔ ہاں وہ کبیر ہی تھا، جو کبھی میرا محافظ ہوا کرتا تھا۔ جانے وہ اس دیرانے میں کیا کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کچھ کہا اور پھر

اچانک اس کی نظر دُور بیٹھے مجھ پر پڑی۔ میری رگوں میں خون جھنکے۔ میں کبیر سے خاصے خاصے پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ماضی اور حال کے حلیے میں زمین آسمان کا فرق تھا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں کبیر کی نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، مگر میں نے لاتعلقی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کبیر خان نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں کسی بھی بہانے وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب چل پڑوں گا۔ کبیر نے اپنے ساتھ کھڑے محافظ سے کچھ کہا اور محافظ سر ہلا کر میری جانب چل پڑا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا کہ کبیر خود میری طرف نہیں آیا، ورنہ وہ میری آواز ضرور پہچان لیتا۔ محافظ نے میرے قریب آ کر سلام کیا اور جیب سے میری ہی ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ”باباجی! ان صاحب کو یہاں آس پاس کہیں دیکھا ہے آپ نے.....؟“ میں نے بظاہر لا پرواہی سے تصویر پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی اور آنکھیں موند کر جواب دیا۔ ”یہ تو کوئی بڑا آدمی لگتا ہے اپنے حلیے سے..... اس چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اس کا کیا کام..... کون ہے یہ آدمی.....؟“ محافظ نے گہری سانس لی۔ ”یہ میرے صاحب کے صاحب ہیں، بہت عرصہ پہلے کہیں چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کر.....! ہم تب سے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“ میں نے چور نظروں سے محافظ کی طرف دیکھا، مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا، شاید کبیر یا کمانی کے ذاتی عملے کا کوئی ملازم ہو گا۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے میرے قریب یوں دیر تک بیٹھے رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کبیر کسی لمحے بھی میری طرف آسکتا تھا یا پھر شاید اسی شخص کو میری بڑھی ہوئی داڑھی اور نگوں کے پیچھے میرے ماضی کی کوئی جھلک نظر آجاتی، لہذا میں نے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں بھڑی جانی۔ ”تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، یہاں آس پاس کی سبھی بستیوں میں اپنی زندگی کے بہت سے سال گزار چکا ہوں، سبھی جگہ آنا جانا گارانتا ہے، یہ شخص کبھی یہاں نہیں آیا، جاؤ کہیں اور تلاش کرو..... میں ڈراڈرے کے لیے پانی بھر لوں۔“ محافظ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب چل پڑے۔

میں نے کچھ دُور جا کر ایک درخت کی اوٹ سے ٹھپ کر دیکھا تو محافظ اور کبیر آجس میں کچھ بات کر رہے تھے، پھر وہ تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور ریاست پور سے مخالف سمت میں آگے بڑھ گئے، لیکن میں کبیر خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اتنی جلدی بار مارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ آج نہیں، تو کل وہ اس راستے پر ضرور چلتا۔ میرے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے موجود تھا کہ میرے یوں چلے جانے کے بعد وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے ہوں گے اور پھر کبیر خان جیسا دُعاوار تو کبھی تک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے ہر وہ جگہ چھان ماری ہو گی، جہاں میری موجودگی کا ڈرہ برابر بھی امکان رہا ہو گا۔ میرا دل ایک بار شدت سے مچلا کہ میں ایک لمحے کے لیے کبیر کو روک کر کہنے کی بارے میں پوچھ لوں، پھر میں اسے اپنی قسم دے کر مٹا لیتا کہ وہ کبھی کسی کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا، مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اندر کے اس اُنال پر قابو پایا۔ کبیر مجھے اپنے ساتھ لیے ہٹا کبھی واپس نہ جاتا، یا پھر خود بھی غر بھر کے لیے سینیں ڈیرے ڈال دیتا۔ ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئیں، سب کچھ دوبارہ سے تازہ ہو گیا، میرے دل و دماغ میں..... یادیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، یا وہ ماضی کو بھلانا صرف دل بہلاوے کی باتیں ہیں، چاہے ہم ساری عمر بھی اپنی یادوں سے فرار لے کر بھاگتے رہیں۔ ہم جہاں تھک کر گرتے ہیں، وہیں سے یادوں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کبیر خان کی آمد نے میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ اب میرا یہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی واپس پلٹ سکتا تھا۔ میں نے مہر دین کے ذریعے شکورے کو بلا بھیجا۔ میری امید کے مطابق سکینہ بھی شکورے کے ساتھ چلی آئی، شاید شکورے نے اسے بھی میری ردا لگی کے خدشے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکینہ میرے لیے کافی فکر مند کھاتی رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”میری فکر نہ کرنا، میں بہت پہلے مر گیا تھا، اب صرف تصدیق ہونا باقی ہے، ہو سکے تو اپنے ماں، باپ اور نانا کی خاطر کسی بہتر اور نیک بندے کو اپنا جیون ساتھی چن لینا، میں جانتا ہوں تمہارے لیے وہ دُوبی زندگی جینا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہو گا، مگر یہ دنیا اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتی ہے، سو، جیسا دیں ہے، دینا بھیجیں اپنالو۔“ میں نے شکورے اور مہر دین کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ ہستی میں میری ردا لگی کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت ہم چاروں کی آنکھیں نم تھیں، وہی کچھ جھوٹے وعدے ہوئے پھر سے ملنے کے، جلد لوٹ آنے کے، سدا ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے.....! جانے یہ آخری ملاقاتیں ہمیں اتنا جھوٹ بولنے پر کیوں مجبور کر دیتی ہیں، جب کہ دُکنے والے اور جانے والے دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ اُن کی آخری ملاقات ہے۔

صبح منہ اندھیرے میں وہاں سے چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی مجھے بس مل گئی۔ میں ڈپ ڈپ سر جھکائے آخری سیٹ کے ایک کونے پر جا کر بیٹھ گیا۔ بس دیہاتیوں سے کھپا کھچ بھری ہوئی تھی۔ گھنٹہ بھر جھکولے کھانے کے بعد اچانک ہی گاڑی ڈک گئی۔ میں نے چونک کر غر اٹھایا، آگے پولیس کانا کہ لگا ہوا تھا۔ دو پولیس والے اوپر چڑھ آئے۔ اُن کی باتوں سے لگتا تھا، وہ کسی خاص شخص کی تلاش میں ہیں۔ اتنے میں ان میں سے ایک کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ چند لمحے مجھ دیکھا اور پھر زور سے چلا یا۔ ”یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔“ (جاری ہے)



..... ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، نلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھڑا ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے اُن گنت بد صورت روئوں، بدینت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بولے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گجر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguogroup.com.pk

پولیس والے کے اس طرح چلانے پر بس میں بیٹھے سارے دیہاتیوں نے گھبرا کر یوں پلٹ کر میری طرف دیکھا، جیسے بس میں کوئی جنگی بمینا گھس آیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں میرے ارد گرد کوئی سپاہی بند و قیس جانے کھڑے تھے، مجھے بس سے اتار کر سڑک کنارے کھڑ کر دیا گیا، مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ پولیس والے میرے قریب آنے سے کھڑا ہے تھے اور میری ہر جنبش پر ان کی مسلسل اور کڑی نظریں جبی تھیں۔ پھر انہوں نے مجھے انتہائی سختی سے ہاتھ فضا میں بلند کر کے کھڑے رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر میں ان کا ایک افسر سرکاری جیب میں وہاں نمودار ہوا، اور اس نے بس کے ڈرائیور اور مسافروں کے نام، پتے نوٹ کرنے کے بعد بس کو جانے کی اجازت دے دی، اس کے کاندھوں پر بے چول بتا رہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس کے ماتحتوں نے اسے زوردار سلامی دی اور کچھ کھسر پھس کی۔ انسپکٹر نے پہلے سر سے پاؤں تک مجھے کئی بار غور سے دیکھا، پھر اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ ”اس کی تلاشی لی ہے۔۔۔۔۔؟“ ”نہیں صاحب جی۔۔۔۔۔ ہم جانچ والے آلے کا انتظار کر رہے تھے۔“ ”انسپکٹر نے غصے سے انہیں جھاڑا“ ”اے۔۔۔۔۔ اس ویرانے میں بارود جھنڈے والا آگہار امانالے کر آئے گا۔ ویسے کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ وہی خود کش ہے، جس کی خبری ہوئی تھی؟“ ”صاحب جی اعلیٰ تو بالکل دی ہے۔ وہی بے ہال، گھٹی لٹوں جیسی بڑی داڑھی، سرخ آنکھیں، نلک کا بھیس۔۔۔۔۔ یہ تصویر دیکھیں ذرا۔“ ”سب انسپکٹر نے جیب سے ایک سادہ کانڈر بنا گا کہ نکال کر انسپکٹر کو دکھایا۔ ان کی باتوں سے مجھے اتنا ہوتا چلا چکا تھا کہ انسپکٹر علاقے کا تھانے دار ہے، اور وہ کسی خود کش کی تلاش میں یہاں تاکہ لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ ہوا میں کھڑے کھڑے اکڑنے لگے، تو میں نے تھانے دار کو پچلی بار مخاطب کیا۔ ”اگر آپ اجازت دیں، تو میں اپنے ہاتھ نیچے کر لوں، میں ایک فقیر ہوں۔ ریاست پور سے آ رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تصدیق کروالیں۔ میں کوئی دہشت گرد نہیں۔“ میری آواز سن کر وہ سارے یوں اچھلے، جیسے میں نے واقعی کوئی خود کش دھماکا کر دیا ہو۔ تھانے دار میری بات سے زیادہ میرے لیے اور مشکوک بھرے انداز سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے قیاس اُتارنے کو کہا۔ میں نے اپنا پھانپا اناچولا اتار کر ایک جانب پھینک دیا۔ کچھ دیر تک وہ سارے زور کھڑے میرا جائزہ لیتے رہے، پھر تھانے دار کے اشارے پر ایک سپاہی نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری مشکلیں کس دیں اور پوری طرح جامہ تلاشی لی، تو تھانے دار سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میرے تھیلے سے انہیں صرف کچھ پتے اور گڑی ملا تھا۔ تھانے دار نے جیب کے وائرلیس سیٹ پر اپنے کسی سینئر سے بات کی اور مجھے قیاس پسنے کا حکم دیا۔ زور ویرانے میں سامنے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کینن نما کھوکھ والے نے تھانے دار کے لیے ابلی ہوئی دودھ پتی چائے کی ایک چینک اور چند چھوٹے پرائے سے شیشے کے گلاس بھجوا دیے اور وہیں درخت تلے کرسی لگا کر تھانے دار کا دفتر بنادیا گیا۔ ان چھوٹے علاقوں میں صدر اور وزیراعظم سے زیادہ تھانے دار کا کردار ہوتا ہے۔ انسان غلام پیدا ہوا ہے اور سدا غلام ہی رہے گا، کبھی اپنی خواہشوں کا اور کبھی اپنے جیسے انسانوں کا۔ تھانے دار نے اذراہ کرم مجھے بھی سائے میں اپنے سامنے زمین پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ”جب تک ریاست پور سے تمہاری بات کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم زیر حراست رہو گے۔ ویسے تمہارا یہ صاف لہجہ اور بات کرنے کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا ہے کہ تم مسایہ ملک کے کوئی جاسوس ہو۔ اس علاقے میں کسی کا لہجہ اتنا صاف نہیں اور یہ تمہارے تھیلے سے میل بھی نہیں کھاتا۔۔۔۔۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون ہو۔۔۔۔۔؟“ ”میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسوں، کل تک جس تھیلے اور بھیس کی وجہ سے یہ دنیامیری راہ میں پلکیں بچھاتی تھی، میری طرف پیچھے کر کے چلنے کو بھی بے ادبی سمجھتی تھی، آج وہی حلیہ اور جو گی کا بھیس مجھے ایک عادی بحرم ثابت کرنے پر ملا تھا۔ سکین کے حصار سے نکلنے ہی اس کی برکت کے اثرات ختم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چالیس میل کا فاصلہ خاص ہجرت کی مسافت کو مکمل کرتا ہے۔ جیسے چالیس دن کا چلہ تلخ یا دوسرے روحانی عوامل کے لیے بہت اہم ہے۔ شاید کچھ شخصیات کا حصار بھی کسی خاص شخص کی ذات پر چالیس کے ہندسے سے مشروط رہتا ہو۔ میں نے بے خیالی میں تھانے دار سے پوچھا ”یہاں سے ریاست پور کتنی دُور ہے۔۔۔۔۔؟“ تھانے دار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”بہنٹھ میل، کیوں؟ مگر تم گلزن کرو، ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہے۔ ابھی گھنٹے بھر میں تمہاری اصلیت سب کے سامنے آ جائے گی۔“ تھانے دار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر دوسری آنے والی جیب میں بٹھا کر تھانے پھنچا دیا جائے۔ ان میں سے کچھ تازہ بھرتی شدہ نوجوان سپاہیوں نے شاید آج تک کوئی دہشت گرد یا خود کش نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے دو مجھے کسی بجوبے کی طرح برت رہے تھے۔ خود کش۔۔۔۔۔ ہم بھی کیسے بد قسمت معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہماری لغت میں جانے کب سے ایسے ہی نئے لفظ شامل ہوتے آ رہے ہیں۔ خود کش، دہشت گرد، درانداز، انتہا پسند، کوئی ایک اچھا لفظ بھی تو نہیں ہمارے مقدر میں۔ ساری دنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی راحت کے سامان کے لیے دن رات جُبار ہوتا ہے۔ مگر نہ جانے ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا کب سیکھیں گے؟ کب ہماری لغت میں دہشت کش، محبت پسند، سکون اندوز نامی لفظ شامل ہوں گے۔ ہم جتنا کب سیکھیں گے؟

مجھے تھانے پھنچا دیا گیا۔ خلاف معمول تھانے کی عمارت باہر سے بڑی پرسکون اور خوب صورت تھی۔ تھانے کے سامنے صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بہ رہی تھی، جو تھانے کی عمارت کے آس پاس پھیلے وسیع و عریض اور سرسبز کھیتوں کو سیراب کرنے کے کام آتی ہو گی۔ تھانے کے پس منظر میں زور پہاڑوں پر سورج کی دھوپ نے سونا پھیلا رکھا تھا۔ نہر کے اوپر ایک چھوٹا سا ایٹھوں کا ٹل تھا، جو تھانے کے مرکزی چوٹی گیٹ کو باہر کی سڑک سے ملاتا تھا۔ جس کے عقب میں تھانے کی پرانی، مگر انگریز دور کی ایک پر شکوہ عمارت استادہ تھی۔ اسی لمحے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ یہ ظاہر پل اور دیواریں ایک جیسے اجزا اور ساخت کی بنی ایٹھوں سے تعمیر ہوتے ہیں، مگر ”پل“، ”لاپ“ کا استعارہ ہوتے ہیں، جب کہ دیواریں جدائی کی علامت بن جاتی ہیں۔ پل لوگوں کو ملاتے ہیں اور دیواریں جدایاں ڈال دیتی ہیں۔ تھانے کی اونچی لمبی دیواروں نے بھی میرے ارد باقی دنیا کے درمیان جدائی کی فاصلہ کھڑی کر دی اور مجھے ایک حوالاتی کمرے میں بند کر دیا گیا، جو تھانے کے صحن میں دھوپ کے رُخ پر بنا ہوا تھا۔ شاید یہ بھی قیدی کو اذیت میں رکھنے کا ایک طریقہ ہو؟ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے کتنے زیادہ طریقے ایجاد کر لیتے ہیں۔ راحت دینے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں بچتا۔ شام ڈھلے تک میں وہیں خوات میں بیٹھا آتے جاتے سپاہیوں اور دیگر سالکوں کو دیکھتا رہا۔ شام کو عصر کے بعد ایک سپاہی نے کم دودھ،

زیادہ پانی دانی پتی سی چائے کا ایک پیالہ مجھے پکڑ دیا۔ ”جانتے ہو، دہشت گردی کی سزا کیا ہے؟ اگر تم پر الزام ثابت ہو گیا، تو سیدھے سولی چڑھ جاؤ گے۔ کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تم نے؟“ میں نے بھری میں مجھے سکینے کی پیش گوئی یاد آگئی، تو گویا میری فاس دہشت گردی کے الزام میں سولی چڑھ جانے سے عبارت ہے۔ چلو، یونہی سہی۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ تھانے دار نے میرے دروازے کے طور پر ریاست پورے شہورے اور مہر دین کو ہلا کر میت ان کے حوالے کر دی ہے، کیوں کہ تھانے دار کو میں پہلے ہی ریاست پور میں اپنی جان بچان کا اشارہ دے چکا تھا۔ میرے بارے میں مزید تو یہ کچھ جانتے نہیں تھے۔ قدرت اپنے مسودے مکمل اور کسی بھی غلطی یا جھول سے پاک لکھتی ہے۔ میں نے اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ قضائے میرے گرد اپنا جال مکمل بن لیا تھا۔ اب تو شگون ہی شگون تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور وہ ناز اور اوجھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر آئینچی۔ کاش! میں ایک بار سے دیکھ پاتا۔ میرا دل کسی نادان بچے کی طرح بھل سا گیا، جیسے ننگے پاؤں..... پھٹے پرانے کپڑوں والے بچے..... اپنی خالی جیبوں کا احساس لیے..... دل کو اچھی لگنے والی..... مہنگی چیزیں..... کسی دکان کے بند شیشوں سے..... پیروں لگ کر تھکتے ہیں ہاں..... میں بھی تم کیوں ہی محسن..... کٹر نیکتا رہتا ہوں۔

میں بھی اسی خالی جیبوں والے بچے کی طرح اُسے ایک بار تھکنے کی آس میں جانے کب دیوار سے ٹیک لگائے سو گیا۔ مجھ جیسوں کے لیے یہ نیند اور خواب کتنی بڑی نعمت ہیں۔ بیداری میں کچھ نہ پانے والے اکثر اپنے خوابوں میں مرادیں پالیتے ہیں۔ میری منت بھی خواب میں پوری ہو گئی۔ میں اس کی آرٹ میٹری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ حسب معمول اپنے کول ہاتھوں کی جادو گری سے میرے مجھے میں جان ڈال رہی تھی۔ مجھے تو وہ خود ہمیشہ کی طرح ایک مجسمہ لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے، دنیا کی کسی زبان یا ڈکشنری کا کوئی لفظ بھی تو ایسا نہیں تھا، جو ہم دونوں کے دل کی باتوں کو کسی بولی میں ڈھال کر منتقل کر سکتا ہو۔ ایسی صورت میں صرف نظری نظر کے لیے زبان کا کام دیتی ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر اُس کے ساتھ نظر کی یہ بولی بولتا رہا اور پھر کسی نے مجھے زور سے آواز دے کر اٹھا دیا۔ ”پہل بھی لٹک بادشاہ.....“ تھانے دار صاب تھے ہمارے ہیں۔ ”میں نے چو تک کر آنکھیں کھول دیں، صبح ہو چکی تھی۔ مجھے جھکڑیوں سمیت تھانے دار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے چند دیگر پولیس افسر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ تھانے دار خود ایک جانب مودب سا کھڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بیٹھے ہوئے افسر خصوصی طور پر کہیں اور سے یہاں آئے تھے۔ سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چند خاکے بنائے گئے اور پہلے سے لائے گئے چند خاکوں اور تصویروں سے میرا حلیہ جوڑا گیا، پھر ایک افسر نے جو عہدے میں ایس پی تھا، مجھ سے پہلی بار براہ راست بات کی۔ ”ریاست پور سے صرف اتنا پتا چلا کہ تم نے کچھ مہینے وہاں ہستی سے باہر درخت تلے گزارے تھے۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے؟“ میں دھیرے سے سُکرایا۔ ”فقیر کا کوئی ایک ٹھکانہ کب ہوتا ہے صاب۔ اس سے پہلے شکر گڑھ کے ریلوے پلیٹ فارم پر ڈیرہ تھا اور اس سے پہلے کہیں اور دیرانہ ٹھکانہ تھا..... اب آپ کی یہ حوالات ہے۔“ ایس پی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مگر تمہارا یہ لب و لہجہ، یہ اعتماد، تمہارے حلیے کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ہمیں الجھا رہا ہے تمہارا یہ اعتماد، میں جانتا ہوں، جن جگہوں کا تم نے ابھی نام لیا، تم نے ضرور وہاں وقت گزارا ہو گا، مگر آخر تم ہو کون؟ تمہارا شناختی کارڈ بھی تو نہیں ہے، جس سے تمہاری پیدائش وغیرہ کا ریکارڈ دیکھا جاسکے۔“ میں نے کمرے میں بیٹھے باقی سب لوگوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ”حیرت کی بات ہے، کوئی اگر آپ بھی کو توئی کے سامنے بات کرتے ہوئے لڑکھڑا جائے، اس کی آواز کانپے، تب بھی آپ لوگ اس پر جھوٹا ہونے کی تہمت لگا دیتے ہیں، اور اگر کوئی بنا گھبرائے اپنا دے جایاں کر دے، تب بھی آپ لوگوں کو اس کا یہ اعتماد مشکوک لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اپنی تفتیش پوری کریں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میرے لیے اب سلاخوں کے پیچھے یا اس زندان سے باہر ہونا ایک جیسا ہے۔ میں دونوں طرف ہی قید رہتا ہوں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلی کریں.....“ میں خاموش ہوا تو ان سب کے متنے ہوئے چہروں پر مزید کئی ٹھکنیں پڑ چکی تھیں۔ ایس پی نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی، جو میرے موجودہ حلیے کے کافی حد تک مشابہہ تھی۔ ”ہمیں اس شخص کی تلاش ہے۔ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بہت سے منصوبوں پر عمل کر چکا ہے اور ابھی تک معصوم لوگوں کی جان کے درپے ہے۔ تمہارا حلیہ اور تمہاری اذھوری کہانی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم ہی دہشت گرد ہو۔ جس کے نہ جانے کتنے نام اور بہروپ ہیں۔ یہ بھی تمہاری طرح بہت سے علاقوں میں جوگی، فقیر یا ملک کے حلیے میں گھومتا رہتا ہے اور موقع پاتے ہی اپنا کام کر جاتا ہے۔ سیکڑوں معصوموں کو دھاکوں میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے یہ اب تک..... لہذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی پوری شناخت واضح کر دو، ورنہ ساری غرائبی سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے۔“ اس کا لہجہ اور ان سب کے توجہ رصاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں میری شناخت جانے جاوہاں سے مجھے جانے نہیں دیں گے، مگر میں انہیں کیا بتاتا۔ میں جس شناخت سے ساری عمر بھگتا رہا تھا، وہ ایک بار پھر میرا مذاق اڑانے کے لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے پولیس والوں کو پھر وہی جواب دیا کہ میری شناخت ایک بھکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں، مگر وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور اگلے روز مجھے ضلع کی بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ میری تصویریں سمجھ کر اخبار اور اشتہار کے ذریعے علاقے میں منادی کر وادی گئی کہ علاقہ پولیس نے ایک مشکوک کو دہشت گردی کے شے میں پکڑا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں اطلاع ہو تو آ کر پولیس سے ملے۔

اگلی صبح سب سے پہلے مجھے شہورے اور مہر دین کی آوازیں سنائی دیں۔ پولیس والے انہیں دو جاہل بوڑھے دیہاتی سمجھ کر دھکڑا رہے تھے، جب کہ وہ ڈہانیاں دے رہے تھے کہ پکڑا جانے والا کوئی دہشت گرد نہیں، ان کا جوگی سائیں ہے، مگر وہاں کوئی ان کی سننے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں نے صبح ہی میری آنکھوں کے نشانات لے کر جانچ کے لیے بڑے شہر بھجوا دیے تھے۔ شہورے اور مہر دین کو تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی تو وہ دونوں رو پڑے۔ ”سائیں جی! تم ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم وہ نہیں ہو، جو یہ سمجھ رہے ہیں۔“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”شاید میں وہ نہیں ہوں، جو تم دونوں مجھے سمجھ رہے ہو اور پھر تم دونوں نے ہی تو کہا تھا کہ سکینے کا دیکھا ہو ابہر خواب سچ ہوتا ہے، تو شاید اس کے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔“ وہ دونوں میرے جھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ پکڑ کر روتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شہورے نے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ جس دن سے سکینے نے وہ خواب دیکھا ہے، تب ہی سے وہ دعا کے لیے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے اور اپنے رب سے ہر گھڑی رورو کر صرف یہی دعا مانگ رہی ہے کہ سائیں کو کچھ نہ ہو، سائیں جی کو ان سب کی غرگ جائے، مگر سائیں کی آنے والی فائل جائے..... اور پھر اگلی صبح چائے پہنچانے والے سنتری نے آ کر زوردار انداز میں سلاخیں کھڑ کائیں۔ ”اٹھ جاؤ ملک بادشاہ..... تمہاری رہائی کا پروانہ آ گیا ہے۔“ میں حیران سا حوالات سے باہر نکلا تو تھانے دار نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ اس بار اس کا لہجہ بہت نرم اور معذرت خواہانہ تھا۔ ”معاف کرنا فقیر..... ہم بھی انسان ہیں، ذہنی کرتے وقت اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ شک کے اوپر ہمارے یقین کا قلعہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہی نہیں چلتا۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ اتنی وضاحت کیوں پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو بالکل ہی شکایت بھی نہیں کی۔“ تھانے دار نے چائے والے لڑکے کو چائے، ناشامیز پر سجانے کا اشارہ کیا۔ ”تم نے کوئی شکایت یا گھٹ نہیں کیا۔ اس بات نے مجھے مزید شرمندہ کر رکھا ہے۔ ہم جس دہشت گرد کی تلاش میں تھے، اسے کل رات سرحد کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمہارے فکر پر نرس کی رپورٹ بھی کیئر آئی ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو، جاسکتے ہو۔ مگر پہلے ناشتا کرو۔“ میرا دل اس وقت کچھ بھی کھانے پینے کا نہیں تھا، مگر

تھانے دار کا دل رکھنے کے لیے میں نے چائے کے چند گھونٹ طاق سے اتارے اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار میرے ساتھ برآمدے تک آیا۔ ”کہاں جاؤ گے؟“ ”کوئی منزل نہیں ہے میری، جہاں قدم اٹھیں گے، اُسی طرف نکل جاؤں گا۔ آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ۔“ تھانے دار مجھ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ ”شاید تمہیں اپنے متعلق بات کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں، چلو جیسے تمہاری مرضی، اکرم خان نام ہے میرا۔ کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو یاد رکھنا۔ اور ہاں، کل جو دیہاتی تمہارے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے تھے، اگر وہ دوبارہ آئیں تو انہیں کیا بتاؤں؟“ میں نے پلٹ کر تھانے دار کی طرف دیکھا۔ ”اُن سے کہیے گا یہاں فنا ہوتا، میرے نصیب میں نہیں تھا، جہاں لکھی ہو گی، وہاں خود پہنچ جاؤں گا۔ میری حاش میں بیٹھنے کی کوشش نہ کریں۔“

میں اکرم خان کو دہیں پہنچا گا چھوڑ کر تھانے کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ پھر وہی پل اور وہی دیوار۔ میں قصبے کی طرف جاتی گینڈی کی مخالف سمت میں چل پڑا۔ راستے میں بادلوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ کچھ کر آپس میں سرگوشیاں کیں اور پھر سارے بادل زور سے گزرا کر ہنس پڑے۔ شربونندیں ایک بے گھر بھارے کے ساتھ آنکھ پھولی کا تھیل کھیلنے، بادلوں کی گود سے ایک ایک کر کے زمین کی طرف لپکتے لپکتے۔ بادلوں نے بھارے کو بھیٹنے دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگا یا اور اپنی بھولی میں ہندو ساری شرارتی بوندیں اس پر برسا دیں، اور پھر موسلا دار بارش شروع ہو گئی۔ ویرانے میں برستی بارش کی بوندوں کی بولی کوئی نئے تو اسے بارش کی تہائی پر بھی پیار آ جائے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھ سے آنکھیلیاں اور خند کر رہی تھیں کہ میں بھی دوسروں کی طرح ان کے شور سے گھبرا کر کسی درخت یا اونٹ کی پناہ تلاش لوں، مگر میں نہیں رکا۔ بیگتارہا، اور بہت دُور تک یونہی چلتا رہا، وہ بہت دیر تک مجھے یاد آتی رہی اور اس اجنبی ویرانے کے اجنبی راستے میری تہائی پر منسکراتے رہے۔ یہ شاعر بھی کیسے کیسے خیال جوڑ لاتے ہیں اپنی تھیل کی کرشماتی دنیائے، زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ان کے بول کسی نہ کسی طور اپنے حال سے جڑے محسوس ہوتے ہیں۔ گھنٹہ بھر بھیٹنے کے بعد مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ مگر نہ جانے میں کہاں تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی، کچھ دیر بعد کسی تیل گاڑی والے نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آواز لگائی۔ ”کہاں جا رہے ہو صوفیو! میں پہنچا دوں؟“ میں نے اس دیاوانے سے پوچھا۔ ”یہ رستہ کہاں جاتا ہے؟“ وہ کوئی پرانا لطیف یاد کر کے زور سے ہنسا۔ ”راستہ تو کہیں نہیں جاتا..... ہمیں پڑا رہتا ہے دن بھر فقیر..... بس میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں۔“ مجھے اس کی زندہ دلی اچھی لگی۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اپنے من کی انجمنیں بھلا کر لوں پر ایک ہلکی سی مسکان برقرار رکھ سکتا ہے، تو یقیناً وہ ”دل والا“ ہے۔ تیل گاڑی نے مجھے کئی سڑک تک پہنچا دیا، جہاں سے گاڑی کا سوار یاں گزر رہی تھیں، مگر میری حالت سردی لگنے کی وجہ سے بگڑتی جا رہی تھی، رات ڈھلنے سے پہلے مجھے بخار ہو چکا تھا۔ کسی بس والے نے ترس کھا کر مجھے بٹھالیا اور بنا پوچھے ہی ایک ویرانے سے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ شاید وہی بس کا آخری سناپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹیشن کے ایک چڑا سی کو میرا خیال رکھنے کا بھی کہہ دیا۔ بخار نے میرے حواس اس بڑی طرح متاثر کیے تھے کہ میں خود کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا، ریلوے اہل کار نے میری حالت دیکھی، تو مجھے کسی بڑے شہر جانے والی ریل گاڑی پر سوار کروادیا اور ٹی ٹی سے درخواست کی کہ مجھے شہر پہنچنے ہی کسی قلی یا مزدور سے کھلو کر شہر کے بڑے اسپتال پہنچا دے۔ دو دن کا طویل سفر میرے ہوش اور بے ہوشی کے وقفوں میں یوں گزرا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ گاڑی رُک تو میں بھی ٹی ٹی کو بتائے لڑکھاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میں مزید ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ تھکن کے مارے میرا ہر حال تھا اور غنودگی کے غلبے نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ ٹک لگا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جب آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ ٹھنی تو میری نظر پلیٹ فارم کے گھڑیال کے ساتھ لگے چلتے بچے برقی بورڈ پر پڑی، جس کے اوپر شیر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک دم شدید اور کان پھاڑ دینے والا شور سا اٹھا، جیسے میری روح کے سارے تار ایک ہی جھٹکے میں کسی نے جھنجھٹا کر رکھ دیئے ہوں۔ یہ تو میرا اپنا شہر تھا۔ ہاں، وہی شہر، جہاں میں پیدا ہوا تھا، وہی شہر جہاں وہ کوچہ جاناں تھا، جہاں وہ رہتی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے اور پلیٹ فارم سے نکلتی ایک گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی، مگر لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ کسی قلی نے آخری وقت پر مجھے سنبھال لیا، ورنہ شاید میں فرین کے نیچے آ کر کٹ جاتا۔ میرے ارد گرد لوگوں کا جھوم اکٹھا ہونے لگا۔ تماشا کہیں بھی ہو، تماشا بین مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں تماشا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ سب مجھے بڑی طرح جھاڑ پلا رہے تھے اور اس حماقت پر ڈانٹ رہے تھے، کچھ نے مجھے خود نکلی کے ارادے کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ خود نکلی بھی کتنا عجیب جرم ہے، جرم کا ارادہ ہوا یا اگر جرم نامکمل رہ جائے تو اس کے لیے کڑی سزا ہے، مگر یہی جرم اگر مکمل ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، اتنے میں کسی شناسا کی آواز جھوم میں ابھری۔ ”ہنو دور یہاں سے، جاؤ اپنا کام کرو تم سب لوگ.....“ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔

(جاری ہے)

بائیں نمونہ جو ان لٹل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا سبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سٹوڈنٹس میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیقی کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زانو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رشتوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سٹوڈنٹس میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں کسی قدر نجات سے کام لیتے ہیں، ہماری سوچ کی پرواز سے بھی تیز، جلد باز اندیشے، مجھے یہی خدشہ تھا کہ یہاں مجھے اپنا کوئی پرانا جانتے والا نہ مل جائے، اور ٹھیک اُسی وقت بھیڑ کو دھکیل کر اندر آنے والے نے میرا اندیشہ بج کر دکھایا۔ آنے والا خانو تھا، کچھ دیر کے لیے تو وہ مجھے دیکھ کر گم صم ہی رہ گیا۔ خود میں بھی اسے یہاں اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ خانو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور رونے لگا ”کیوں ظلم کرتے ہو تم غریبوں پر سائیں، کیوں بار بار مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہو؟“ میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔ ”مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟“ ”آس پاس کھڑے لوگ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ خانو نے حسبِ عادت کسی حوالہ کی طرح سب کو ڈانٹا ”جاؤ یہاں سے بابا..... کیا مصطفیٰ قریشی کی کوئی فلم چل رہی ہے، جو تم سارے یوں منہ کھول کر کھڑے دیکھ رہے ہو۔ جاؤ، کام کرو، اپنا، شکر کرو سائیں جی ادھر آ گیا ہے، اب دیکھنا کیسے تم سب کی قسمت بدلتی ہے۔ چلو، اب بھاگو سارے یہاں سے۔“ ”دیر سے دیر سے بھیڑ جھٹکتی تھی۔ خانو نے مجھے بتایا کہ اس کے حالات ذرا بہتر ہوئے تو یہی نے ضد کی کہ اب انہیں بچوں کی تعلیم کے لیے یہ چھوٹا قصبہ چھوڑ کر کسی بڑے شہر منتقل ہو جانا چاہیے۔ لہذا خانو نے کچھ عرصہ قتل کسی سے سفارش کروا کر یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر اپنا چھوٹا سا کیمپ بنالیا اور اب وہ اپنی بیوی بچوں سمیت اسی شہر میں منتقل ہو چکا تھا۔ جانے میری قسمت کے خالی کنگول میں مقدر بار بار میری پرانے نئے کیوں ڈال دیتا تھا۔ مجھے خانو کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادہ بے لوث انسان میرے لیے اپنی جان سے بھی گزر سکتا تھا، مگر..... وہ میرا نادان دوست تھا۔ اور مجھے شاید کسی وانا دشمن کی تلاش تھی۔ خانو کا کھو کھایا بھی خوب چلتا تھا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی سب پر اپنا خواہ مخواہ کا رعب جما رکھا تھا۔ خانو نے تھوڑی دیر ہی میں پلیٹ فارم کے شیدے پر بے کھلے آسمان تلے ایک بوڑھے برآمد کے درخت کے نیچے میرا ہمراہ بنا فقیر کا ٹھکانہ بھی بھلا کیا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ ایک پھل پھلانا پھلنا، جو نہ دھوپ روک سکتا ہے نہ بارش۔ درخت کے نیچے یہاں بھی کئی اینٹ اور سینٹ سے بنے ایک گول چبوترے نے برآمد کی جڑوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، بالکل میرے غلوں کی طرح، جو ہر لمحہ میرے گرد اپنا گھیر ڈالے رکھتے تھے۔ رات کو گھر جانے سے پہلے خانو کچھ دیر میرے پاس رُکا اور میری خست حالی دیکھ کر گھبرا گیا ”تمہیں تو شاید شدید بخار لگتا ہے جو گی سائیں۔“ ”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ٹھکن ہے بہت لمبے سفر کی، تم جاؤ یہی بچے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے، مجھے ابھی جاگنا ہے، اس شہر کا آسمان اور یہ سارے میرے پرانے دوست ہیں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں، ان سے مجھے آج رات.....“ ”نہ چاہتے ہوئے بھی خانو مجبور انہوں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مگر اس کے جاتے ہی جانے کیوں مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں اسے کچھ دیر مزید روک لیتا تھا چھوٹا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی بڑا جان لیوا تھا کہ میں اپنے ہی شہر میں تنہا ہوں۔ ریت، افٹوں اور سینٹ کی بنی چند عمارتوں اور سڑکوں سے پرے شاید وہ بھی اسی تاروں بھرے آسمان تلے جاگ رہی ہو گی، شاید اپنی آرٹ گیلری میں کوئی مجسمہ تراش رہی ہو گی یا پھر شاید اپنی چھت پر اپنی پسندیدہ وزرد پھولوں والی نیوی بلیو شال پہنے ہاتھ میں کافی کا گنگ تھا میری طرح ستاروں سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ آسمان بھی تو اس کی شال کی طرح تھا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں، تو مجھے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا، کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ میں بھی ساری رات خود سے بھاگتا رہا۔

صبح تک میں مزید غم نہ حال ہو چکا تھا اور جب دن کی روایتی بھیڑ اور چہل پہل کا دور شروع ہوا، تو حسبِ معمول سب سے پہلے ضعیف العقیدہ لوگ ہی میرے آس پاس جمع ہونے لگے۔ شاید اس میں میری پرانی شہرت کا بھی ضرور کچھ حصہ رہا ہو گا، کیوں کہ ریلوے کے جن اہل کاروں کی ٹرین ڈیوٹی کا روتھ شکر گڑھ رہا تھا، وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور انہوں نے میری نام نہاد ”کرامت“ کے بہت قصبے عن رکھے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آتے جاتے لوگوں کو یوں ٹھٹھک کر درخت کے قریب جمع ہوتے دیکھا۔ تو وہ بھی اپنے دفتر سے باہر نکل آیا اور جھڑک کر پوچھنے لگا ”یہ کیا تمنا شاگار کھا ہے، کون ہے یہ بھڑوب؟“ ”اسٹیشن ماسٹر کی آواز سن کر ریلوے کے چھوٹے موٹے اہل کار ادھر ادھر بدک گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے غور سے دیکھا ”کون ہو تم..... اور کیا تم جانتے نہیں کہ ریلوے کی سرکاری زمین پر کوئی بھی مستقل یا عارضی بستی ناجائز ہے۔“ ”میں بہ مشکل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔“ ”میرے بھی بھلا کبھی ممنوع اور غیر ممنوع ہوتے ہیں جناب؟ شاید مکین ممنوع یا غیر ممنوع ہوتے ہیں۔“ ”میں نے جانے کے لیے قدم بڑھانے، مگر بخار کی ٹھکن اور فطرت کی وجہ سے ایک زوردار چٹکر آیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے تھامنے کی کوشش کی ”ارے ارے..... سنبل کے بھتی، تمہاری طبیعت تو بہت نامسا ز گنتی ہے۔“ ”اسٹیشن ماسٹر کی آواز پر قلمی دوڑنے پلے آئے اور انہوں نے بھی مجھے سہارا دے کر دوبارہ میرے مسکن پر بٹھا دیا، میں نے اسٹیشن ماسٹر کو تمسلی دینی ”نہیں، میں ٹھیک ہوں، میں خود بھی یہاں سے جانا چاہ رہا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ زیادہ دیر نہیں ٹھوکیں گا یہاں پر۔“ ”اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر عدم امت کے آثار تھے۔“ ”نہیں نہیں، ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم تو جانتے ہو، کچھ لوگ اسی طرح چھتر ڈالتے ہیں اور پھر دیر سے دیر سے سرکاری زمین پر پہلے پکا بھونپڑا اور پھر چار دیواری کھڑی کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ بطور اسٹیشن ماسٹر میرا فرض ہے کہ میں پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی حدود میں کسی بھی ناجائز تجاوز کو روکوں، مگر تم اس وقت اس قابل نہیں ہو کہ اپنے بل بوتے پر ایک قدم بھی چل سکو۔ کچھ دن آرام کرو، طبیعت سنبل جانے تو چلے جانا۔“ ”میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔“ ”آپ کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ مگر یہ شہر مجھے کانٹے کو دوڑتا ہے۔ آپ ایک احسان اور کردیں مجھ پر، یہاں سے کہیں بہت دُور دراز جانے والی کسی گاڑی پر سوار کروادیں مجھے.....“ ”اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کا ایک ماتحت وہاں آہنچا۔ ہر شڈنٹ آفس سے فون ہے آپ کا صاحب۔“ ”اسٹیشن ماسٹر نے سر ہلایا اور جانے سے پہلے ایک لمحے کے لیے میرے پاس رُکا ”اگلاز نام ہے میرا، فی الحال تم آرام کرو۔ میں ذرا دفتر کے معاملات منٹاؤں۔ تمہارے جانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ذرا مہر سے کام لو۔“ ”اسٹیشن ماسٹر پلٹ گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے زندگی میں کڑواہٹ کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ اب بیٹھے کی عادت ہی نہیں رہی، پھر چاہے وہ ممبر کا چھل ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ دیر بعد ایک ریلوے اہل کار بخار کے شربت کی بوتل اور چند گولیاں مجھے تھما گیا۔ ”یہ دو اینٹیاں اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بھیجی ہیں۔ جلدی سے یہ گولیاں اور شربت غلک جاؤ۔ ہمارے اگلاز صاحب نے ڈیپنر کو رس بھی کر رکھا ہے۔ یہاں سب کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج وہ خود ہی کرتے ہیں۔ شام کو ان کی بیٹھک میں خوب ہجوم رہتا ہے۔“ ”وہ باتوں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور جب تک وہاں سے نہیں ہلا، جب تک میں نے دوا کی خوراک لے نہیں لی، کچھ لوگ اپنے لفظ اسٹے بے دریغ کیوں لاتے رہتے ہیں۔ جانے مجھے ہمیشہ سے ایسا کیوں لگتا تھا کہ لفظ ادا ہونے کے بعد ہمیں خالی کر جاتے ہیں۔ کچھ دیر میں خانو آ گیا اور اپنا کیمپ کھولنے کے بجائے سیدھا میری طرف چلا آیا۔ ”سائیں جی، وہ کاٹھیلے والا بتا رہا تھا کہ اپنے اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے تھے تمہاری طرف، سب خیر تو ہے ناں!!“ ”ہاں، سب خیر ہے، وہ اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے۔ اچھے انسان ہیں۔“ خانو کے چہرے پر چھائی فکر مندی کی لکیریں چھٹ گئیں۔ اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اگلاز صاحب کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا کہ دیکھنے میں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب بہت سخت نظر آتے ہیں، مگر دل کے بہت اچھے ہیں، سب ملازمین کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ، جانے یہ اوپر سے سخت نظر آنے والے اکثر اندر سے اتنے نرم اور نیک دل کیوں ہوتے ہیں۔ شاید یہ ساری دنیا ہی ایسے تضادات کا مجموعہ ہے۔ میں دن بھر وہیں منہ ڈھاپے پڑا رہا۔ فطرت اور بیماری بھی کتنی بڑی معذوری ہوتی ہے۔ یا تو ہمارے دل اور دماغ کو اتنی قوت پر دوا نہیں دی گئی ہوتی یا پھر ہمیں اس کم زور جسم اور قوتِ ارادی کے تابع نہ کیا گیا ہو تا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کی خواہش میں بس پھڑک کر بی رہ جائیں۔ میں بھی سارا دن اسٹیشن چھوڑ کر کہیں دُور نکل جانے کے اپنے کم زور ارادے سے لڑتا رہا، مگر میرے لاغر جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔

شام کو اگلاز صاحب نے بھی دوسرا پھیر ڈالا اور حال چال پوچھ کر جاتے جاتے جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری طرف پلٹ آئے۔ بات چیت سے تو تم کافی پڑھے لکھے لگتے ہو، پھر یہ جو گ کیوں لے رکھا ہے۔ بھی معاف کرنا میں اس بھری فقری پر اعتبار نہیں کرتا۔ آج کل کے اس منافق دور میں اصل پور فقیر بھلا کہاں پائے جاتے ہیں؟“ ”اگلاز صاحب کے لیے میں تلخی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ”ٹھیک کہتے ہیں آپ، کاش ایہ چھوٹی سی بات اس ظاہر پرست دنیا کو بھی سمجھ آ جائے کہ صرف حلیہ، درویشی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ دیوانے اور بھڑوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ ”اگلاز صاحب نے چو تک کر میری طرف دیکھا۔ ”آدمی دل چسپ لگتے ہو۔ موقع ملا تو کبھی تصفیاً بات ہو گی۔ تم آرام کرو۔“ ”اسٹیشن ماسٹر کے جاتے ہی دُور اپنے ٹھیلے پر بے چین کھڑا خانو لپک کر میرے قریب آ گیا، ”کیا کہہ رہے تھے، اسٹیشن ماسٹر صاحب! میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا۔“ ”ہاں کہہ رہے تھے کہ یہ خانو سارا دن ادھر کی ادھر لگتا رہتا ہے، دل لگا کر کام نہیں کرتا، وقت ضائع کرتا ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ تمہارے ٹھیکے کا لائسنس منسوخ کر دیں۔“ ”میری بات سن کر خانو کے چہرے کا رنگ ڈر گیا۔“ ”کیا بول رہے ہو جو گی سائیں، میں تو سارا دن محنت کرتا ہوں۔“ ”تم محنت کم، باتیں زیادہ کرتے ہو۔ آج سے کوشش کرو کہ انہیں دوبارہ تم سے شکایت نہ ہو۔“ خانو نے جلدی سے سر ہلایا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جلدی سے اپنے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا اور میں نے سکون سے سر نکالیا۔ میں جانتا تھا کہ اب رات گئے تک کام میں بھگا رہے گا، میرا وہ نادان دوست۔

شام ڈھل چکی تو میرے دل کے اندر میرے بڑھ گئے اور اسٹیشن روشنیوں سے جھگڑانے لگا، مگر جو میرے تاریک دل کو اُجالا سکا، وہ اُجالا کہاں تھا میری قسمت میں۔ خانو بے چارہ دن بھر کام میں مبتلا رہا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے اسے بتا کر جاؤں گا کہ میں نے اس کی ناز برداری اور خدمت گزار سے کیسے بے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں وہ پھر تھا جس سے ٹکرانے والا پھاری بدلے میں صرف زخم ہی پاسکتا تھا۔ رات ہوئی تو

اسٹیشن ماسٹر صاحب حسبِ معمول اسٹیشن کا ایک آخری جائزہ لینے کے لیے پلیٹ فارم پر سارے موجود اہل کاروں کو ہدایت دیتے نظر آئے، مگر جانے کیوں اس رات مجھے اگلاز صاحب کی چال اور آواز میں وہاں تک نہیں اور کڑک مفقود محسوس ہوئی، جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ رک گئے ”تم سوتے نہیں ہو کیا، طبیعت اب کیسی ہے تمہاری؟“ ”ٹھیک ہوں، بس نیند آتے آتے آتی ہے۔“ وہ جھٹکے ہوئے انداز میں وہیں چبوترے پر میرے قریب بیٹھ گئے ”ہاں ٹھیک کہا تم نے، کبھی کبھی تو نیند بھی خنری شہزادی بن جاتی ہے۔“ ”آپ آج کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟“ ”انہوں نے ایک گہری سانس لی ”ہاں، اب تو ٹھیک ہی سمجھو، وہ کہتے ہیں ناں، درد کا حد سے گزر جانا ہی دوا ہو جاتا ہے۔ تم یہاں نئے ہو، اس لیے تمہیں نہیں پتا کہ آج کا دن بڑا بھاری گزرتا ہے مجھ پر۔ پرانے ملازمین سارے واقف ہیں اس کہانی سے۔“ ”میں نے غور سے اس ٹوٹے ہوئے انسان کی طرف دیکھا۔ ہمارے آس پاس بکھرے ان ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے ہر ایک اپنے اندر کتنا غم چھپائے، کتنا درد دبائے بیٹھا ہے، مگر ہم خود غرضوں کو اپنے سوا دوسرا کوئی نظر ہی کب آتا ہے بھلا؟“ ”اگر مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ بتائیں۔“ ”اگلاز صاحب نے لمبی گہری سانس لی ”میں بیوی کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔ اس بد نصیب نے بھی کم دن ہی خوشی دیکھی۔ اب تو سارا وقت بستر پر پڑی رہتی ہے۔ ہماری ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی شریا..... بچپن ہی سے ہم دونوں کی جان..... لاڈ اور نازوں سے پلی۔ اسکول کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ہر مضمون، ہر مقابلے میں اول۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ سچ پوچھو، تو اس کی خوب صورتی سے ہم دونوں میاں بیوی کبھی کبھی خوف زدہ ہو جاتے تھے، اس لیے جلد ہی

اس کے ہاتھ پھیلنے کے رکھنے کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ بہت سے رشتے آئے، مگر مجھے خاص طور پر کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی، جہاں ساس نندوں کا جھیلنا بھی کم ہو، اور لڑکا معاشی طور پر بھی کافی مضبوط ہو۔ ہم نے شریا کو بہت نازوں سے پالا تھا۔ اور ہمیں یہ ڈرتھا کہ دور روایتی ساس نندوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی برداشت نہیں کر سکے گی۔ آخر کار، رشتہ لانے والی نے ایک ایسے لڑکے کے بارے میں بتایا، جو کچھ عرصہ پہلے ہی بیرون ملک سے کافی کچھ کما کر دوبارہ اپنے ملک منتقل ہوا تھا۔ اکیلا رہتا تھا اور یہاں رشتے کا بھی خواہش مند تھا۔ مجھے لگا، جیسے قدرت نے یہ رشتہ میرے صبر کے بدلے ہی بھیجا ہے۔ ہم نے ہر طرح سے چھان بھینک کر لی۔ لڑکا واقعی بہت شریف اور خاندانی تھا۔ اور شریا کی تصویر دیکھ کر تو اس نے رشتہ والی کاوری پکڑ لیا تھا کہ اب وہ رشتہ کرے گا تو ہماری شریا سے، ورنہ

ساری عمر کنوارا ہی رہے گا۔ لڑکے کا نام کلیم تھا، مگر میری بیوی اس رشتے کو قبول کرنے میں ذرا انچکھاری تھی۔ ”میں نے حیرت سے اگلا صاحب کی طرف دیکھا ”مگر کیوں؟“ اگلا صاحب نے نظریں نیچے کالیں ”دراصل لڑکا کچھ کم ضرورت تھا، ہماری شریا کی دودھ جیسی شفاف رنگت کے سامنے کلیم کا گہرا سانولار رنگ اور نین فتوش بہت بچہ محسوس ہوتے تھے۔“ اگلا صاحب کی بات سن کر مجھے ایک زور کا جھٹکا لگا ”شریائے کلیم کو دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے اس کا کیا فیصلہ تھا اس بارے میں.....“ ”شریایا فیصلہ وہی تھا، جو کسی بھی شریف مشرقی گھرانے کی لڑکی کا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ حق اپنے والدین کو تفویض کر دیا تھا۔ بالآخر پیلو پر غور کرنے کے بعد قرعہ کلیم کے نام ہی گھلا اور ہماری لاڈلی ہماری دعاؤں اور آنسوؤں کے حصار میں کلیم کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”پھر آپ اسے اداس کیوں ہیں، انسان کا توازن خوب صورت ہونا چاہیے کہ بیرونی بد صورتی کی تو عادت پڑ جاتی ہے۔“ مجھے لگا یہ سوال میں نے اگلا صاحب سے نہیں، خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ اگلا صاحب نے لمبی گہری آنکھیں مچھلی۔ ”ہاں! میری شریا نے پہلے دن ہی سے ہماری خوشی کے لیے کلیم کو پورے دل سے قبول کر لیا تھا۔ کلیم تو پہلے ہی سے شریا کے پیار میں دیوانہ تھا، مگر.....!!“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا ”مگر کیا؟“ ”مگر یہ دنیا والے بھلا کب کسی کو بھلا چھوٹا اور خوش دیکھ سکتے

ہیں۔ کلیم اور شریا جس محفل میں بھی جاتے اور جہاں سے بھی گزرتے، ان کی جوڑی کو دیکھ کر لوگ معنی نیر اشارے کرتے، طنزیہ مسکراہٹوں کے تہا لے ہوتے، پہلوئے حور میں لنگور، جیسے فقرے کسے جاتے۔ نگ آ کر کلیم نے شریا کو کہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا، مگر لوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ کلیم اپنی محرومیوں کا غصہ شریا پر اتارنے لگا۔ اس کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ ضرور شریا کے کردار میں کوئی کھوٹ یا کمی ہوگی، ورنہ اس جیسی پری چہرہ لڑکی کلیم جیسے کم ضرورت کو کیوں قبول کرتی؟ کلیم کا جنون بڑھتا ہی گیا اور شریا کی ٹوہن ضرورتی نے اسے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا۔ اسے کھلی بھلے، حتیٰ کہ شہر کا ہر بندہ اہل مذاق اڑاتا محسوس ہونے لگا۔ شریا کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ مجھ سے اور شریا کی ماں سے ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ رشتہ ہمیشہ جوڑ والوں میں کرنا پڑا ہے، پھر چاہے یہ جوڑ معاشی حالات کا ہو یا صورت کا۔ بے جوڑ رشتے کبھی زیادہ دیر چل نہیں پاتے۔ کلیم شریا پر شک کرنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اسے ڈھنک کر رکھ دیتا اور پھر ایک دن شریا اس حالت میں گھر واپس آئی کہ اس کا چہرہ اور بدن ٹپل ٹپل تھا۔ اور..... اور پھر.....“ اگلا صاحب کی قوت گویائی جواب دینے لگی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا ”پھر کیا ہوا؟“ ”اور پھر شریا کے آنے کے دو روز بعد کلیم نے اسے طلاق بھجوادی.....“ میری آواز حلق میں اٹک سی گئی ”طلاق.....“ ”ہاں! طلاق.....“ تین سال پہلے ہماری شریا گھر واپس آ گئی تھی۔ بہت صابر شا کر تھی میری بیٹی، کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس کی ماں نفسیاتی دباؤ اور شوگر سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوتی گئی، مگر شریا سستی رہی۔ اور پھر ایک دن چپ چاپ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ گئی۔ ”مجھے یوں لگا، جیسے اگلا صاحب نے کوئی کند چھری ٹھیک میرے قلب میں اتار دی ہو۔“ ”کیا..... شریا مر گئی؟“ ”ہاں، آج اس کی تیسری برسی ہے۔“ مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ اگلا صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے لگا، وہ میری اپنی کہانی بنا کر پلٹ گئے تھے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک میں ہی ان مذاہب کا شکار ہوں، مگر یہاں تو ہر قدم پر ایک ”پڑی زاد“ کسی نئے روپ اور نئے نام کے ساتھ دھڑا دے بیٹھتا ہے۔ اگلا صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جوڑے ہمیشہ جوڑ والوں کے بھلے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا، میں یعنی کی زندگی سے چپ چاپ نکل آیا۔ ہم دونوں بھی تو اسی عالم دنیا کے ہاں تھے، یعنی مجھے قبول کر بھی لیتی تو یہ جگہ والے ہمیں جینے نہ دیتے۔ یہاں روپ کا بدل صرف روپ ہے، ترازو کے ایک پلڑے میں حسن ہو تو دوسرا بات بھی اسے متوازن کر سکتا ہے، جب وہ خود بھی حسین ہو۔ ساری رات میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسنیات ہوتی رہی، جیسے قدرت نے میری کہانی کا انجام کسی دوسرے کی زبانی مجھ تک پہنچا دیا ہو۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر خانو کی بجلی بجی آواز دیں نے مجھے دوبارہ جگایا۔ صبح ہو چکی تھی، خانو مجھے بتا رہا تھا کہ ”سائیں یہ بیٹی کب سے آپ کے جانگے کا انتظار کر رہی ہے۔ کہتی ہے، سائیں کا بڑا نام بتا ہے۔ دعائیں آئی ہے۔“ میں نے چونک کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں ہی میرے لیے آسمان، زمین پر ڈھے گیا اور زمین فلک سے جا ملی۔ میرے سامنے مٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں، میری ہمسہ ساز۔ وہی قراۃ العین..... مگر اس کی آنکھوں پر یہ سیاہ چشمہ کیوں لگا ہوا تھا ابھی تک۔ میں نے خانو کو اشارہ کیا کہ وہ لڑکی سے کہے، چشمہ اتار دے، مگر خانو چاکا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہماری آواز میں کہا۔ ”بیٹی! اپنے چہرے سے اندھیرے کا یہ پردہ ہٹا دو تاکہ میں تمہاری آنکھوں میں جھانک کر تمہاری روح کے زخم دیکھ سکوں۔“ مگر وہ رو پڑی۔ ”نہیں سائیں جی! میری آنکھیں بے نور ہیں۔ آپ ان میں جھانک کر بھی صرف اندھیرے ہی دیکھیں گے۔ میں زور سے چلا اٹھا۔ ”کیوں..... تمہاری آنکھیں اب تک بے نور کیوں ہیں.....؟ اگر دعا ہی کروانی ہے تو اپنی بیٹی کی دعا کرو۔“ ”یعنی نظریں پڑا گئی۔“ ”نہیں سائیں، جس کو دیکھنے کے لیے مجھے بصارت چاہیے تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں بیٹی کا کیا کروں گی۔“ میں اس کی بات سن کر سسک اٹھا۔ وہ بھی روتی رہی اور پھر اچانک میرے کانوں میں خانو کی آواز گونجی۔ ”سائیں بی! کیا ہوا، سب خیر تو ہے ناں..... تم رو کیوں رہے ہو، کیا کوئی برا پہنچا دیکھا ہے۔“ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خانو مجھ پر ٹھکا ہوا میرے گالوں سے میرے آنسو پونچھ رہا تھا۔ گویا میں واقعی خواب دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خانو کو سمجھا بھجا کر کام پر بھیجا، مگر خود میرا چین و سکون مزید برباد ہو گیا۔ کچھ خواب ہمیں کس قدر بے سکون کر جاتے ہیں۔ بچنے کے پتھرے میں بند یہ دل ایک دم ہی ہر دیوار، ہر رکاوٹ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا۔ مجھے لگا، جیسے وہ خواب ادھر وادھر گیا ہو۔ شاید مٹی کی آنکھیں واپس مل چکی ہوں، مگر میری آواز پہچان کر اور میرے چہرے کو دیکھ کر اس نے مجھے نہ پہچاننے کے لیے یہ ساری کہانی گھڑی ہو۔ مجھے خانو پر شدید غصہ آنے لگا، جس نے درمیان میں میری نیند توڑ کر مجھے خواب کے آخری حصے اور انجام جاننے سے روک دیا۔ سکینہ نے کہا تھا کہ محبت میں ایک دقت ایسا آتا ہے، جب ہمارے خواب سچ ہونے لگتے ہیں۔ قدرت نے ایک ہی رات میں مجھے دو اشارے دیے تھے۔ پہلا شریا اور کلیم کی کہانی بتا کر اور دوسرا یہ ادھر وادھر خواب دیکھا کہ۔ یقیناً قدرت مجھے یہ جتنا چاہ رہی تھی کہ مٹی اگر بیٹی ملنے کے بعد مجھے دیکھ لیتی، تو وہ ضرور دروڑ کر خدا سے یہی شکوہ کرتی کہ اس چہرے کو دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ اسے دوبارہ بصارت ہی نہ ملتی۔ وہ اندھ ہی رہتی تو اچھا تھا۔ میرے اندر چلتے بھڑکے ہوئے تھے۔ جیسے واقعی میں نے مجھ دیکھ لیا ہو۔

میری حالت شام تک اتنی بگڑ گئی کہ سانس بھی ایک ایک کر آنے لگی۔ خانو نے مجھے یوں ترپے دیکھا تو بنا کچھ کہے ایک جانب بھاگ گیا۔ اور گھنٹہ بھر بعد شہر کے ایک مستند ڈاکٹر کی دواؤں کا بکسہ اٹھائے اس کے آگے آگے بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اور تشویش سے خانو کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے سائیں کی حالت تو بڑی خراب ہے، میں دوا کی تین خوراکیں دیے تو جا رہا ہوں، مگر ہو سکے تو سائیں کو شہر کے بڑے اسپتال پہنچانے کی کوشش کرو۔“ خانو نے تجزی سے سر ہلایا، مگر وہ اندر سے جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے کہیں نہیں ملنے والا۔

اگلے روز بادل بھر ٹوٹ کر برسے، میری سانس اکھڑنے لگی تھی، جیسے سینے کی قید سے آزاد ہونے میں اسے بہت سی سلاخوں سے ٹکرا کر باہر نکلتا پڑ رہا ہو۔ میری نظر دھیرے دھیرے پھرانے لگی، تو خانو نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو سائیں، ایک بار میری بات بھی مان لو، چلو کسی بڑے اسپتال چلتے ہیں۔“ میں نے برستی بارش کی بوندوں میں خانو کے آنسو پانی میں مل کر پانی ہوتے دیکھے اور مسکرا دیا۔ میری آواز ٹک ٹک کر نکل رہی تھی۔ ”کیوں ڈھونڈی کہیں کے..... ذرا سی بیماری نے ہی تمہارے سائیں کی کرامات پر تمہارا یقین اور اعتماد چٹا دیا؟“ ابھی کل تک تو تم سارے علاقے میں سب سے کہتے پھرتے تھے کہ تمہارا جوگی سائیں اپنی دعا سے ہر بیماری اور ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ اور آج جب خود تمہارا سائیں بیمار پڑا، تم اسے شہر کے بڑے اور تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضد کر رہے ہو۔ اگر میری دعاؤں میں باقی لوگوں کے لیے اتنا اثر ہوتا تو کیا آج میری اپنی بیماری ایک پھونک ہی میں ہوا نہ ہو جاتی؟“

تیز بارش میں بھیگتی ایکسپریس گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی، تو ایک پھلچل سی جگ گئی۔ کچھ مسافراترے اور کچھ ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میں نے ڈور اسٹیشن کے بیرونی گیٹ سے ایک نوجوان جوڑے کو اندر آتے دیکھا۔ مرد تیز بارش سے خود کو کچھاتے ہوئے کسی کی تلاش میں برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ میری لمبی جٹا دھاری بالوں کی ٹیٹس بھیگ کر میرے چہرے کے گرد پھیل چکی تھیں۔ میں سر جھکائے یوں مرا تے میں پڑا ہوا تھا، جیسے اپنی آخری سانس نکلنے کا خود انتظار کر رہا ہوں۔ اچانک میرے قریب ہی سیاہ لباس میں کسی نازک سے سراپے کا بیولا ابھرا اور وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ خانو نے اسے دے لفظوں میں میری بیماری اور بگڑتی حالت کے بارے میں بتایا، مگر وہ برستی بارش میں یوں ہی دھڑو دھڑو بیٹھی رہی۔ خانو کو مجبوراً وہاں سے اٹھ کر جانا پڑا تاکہ وہ تنہائی میں مجھ سے اپنی منت بیان کر سکے۔ فضا بہت اور خنودگی سے میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں، مگر جان یوں اٹکی ہوئی تھی، جیسے ضد پرازی ہو۔ اور پھر وہ ہلکا سا کھٹکار کر بولی تو اس کی مترنم آواز نے میرے وجود میں ٹھنسی سبھی خفیہ گھنٹیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ارد گرد زلزلہ آ گیا ہو۔ میں اس مٹی کی آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں..... یہ اسی کی آواز تھی، جس کی سانسوں کی آہٹ بھی میں سن سکتا تھا۔ میرا خواب سچ ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ”مجھے بتا ہے کہ آپ اپنے ارد گرد دو خواتین کی موجودگی پسند نہیں کرتے، اور نہ ہی کسی عورت سے ہم کلام ہونا آپ کو اچھا لگتا ہے، مگر میں آج بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ کئی سال سے بھٹک رہی ہوں وہ بدر..... میرا کوئی اپنا کھو گیا ہے۔ آپ کی دعا کا بڑا بچہ چاہتا ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔“ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میری دعا میرے سامنے بیٹھی مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی تھی۔ وہ بے چینی اور پریشانی میں اپنی خوب صورت انگلیوں کو حسب عادت بار بار آپس میں جوڑ کر کھول رہی تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھے، جنہوں نے کبھی میرا چہرہ چھو کر ایک ہمسہ تراشا تھا۔ میری فحشی نظریں اس کے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی، پہچانتی بھی کیسے۔ اس نے آج تک مجھے دیکھا ہی کب تھا؟ میری سانس اکھڑنے لگی۔ مجھ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ میری رکتی سانسوں کی آواز سن کر وہ گھبرا کر میرے اور قریب آ گئی ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ دفعتاً میری نظریں اس کی آنکھوں پر لگے کالے چشمے پر پڑی تو میرے اندر بیک وقت کئی بھڑکے چلے گئے۔ حسب توقع ایک چشمہ اس کی خوب صورت سرمئی آنکھوں کا ہرے دار بنا بیٹھا تھا۔ کہیں خدا نخواستہ مٹی کی آنکھوں کا آپریشن واقعی ناکام تو نہیں ہو گیا تھا۔ تیز بارش اس کا نازک وجود بھگوری تھی، میرا جی چاہا کہ میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے وجود کے لیے جھڑی بن جاؤں، مگر میں تو خود کسی کم زور بچے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی دوڑا نو بیٹھی بیٹھتی رہی اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل کسی نے منہی میں لے کر مسل دیا ہو جیسے۔ اسے آواز دے کر روک لینے کی خواہش کو میں نے نہ جانے کس طرح روکا۔ بس زبان داغوں تلے داب لی۔ نہرتے ہوئے اچانک پانی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ڈو ڈو لگا لگی، میں تروپ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کے طور پر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ کسی سہارے کی تلاش میں فضا میں لہرائے اور میرے چہرے کو چھو گئے۔ میں گھبرا کر چیخے بنا، وہ کچھ لمحوں کے لیے حیرت اور صدمے سے سششہ رہ گئی اور پھر اس نے بے تابی سے دوبارہ میرے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیریں اور زور سے چلائی ”پڑی زاد..... یہ آپ ہی ہیں ناں..... آپ چپ کیوں ہیں.....؟ بولتے کیوں نہیں.....؟“ میں اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہاں سے اٹھ کر چند قدم بھاگا، لیکن مجھ میں بھاگنے کی ہمت اور طاقت نہ تھی، تو پھر رونامی کس بات کا تھا۔ میں لڑکھڑا کر یوں گرا، جیسے کوئی کسی کی نظر سے گرتا ہے، مگر مجھے دنیا کی نظر سے گرنے کی پرواہی کب تھی۔ مجھے تو بس اس ایک نگاہ سے پچتا تھا کہ جس میں کبھی میرا ایک مقام تھا۔ مجھے زمانے کی ہر فاقہ قبول تھی، مگر اس کی نظریں غرت یا رحم اور ہمدردی کی جھلک میرے لیے دنیا کی ہر موت سے کہیں بڑھ کر تھا تھی۔ میں نے خود کو پوری طرح سمیٹ کر چھپا لیا۔ اچانک میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔ ”کہاں تک بھاگیں گے اور کب تک خود کو چھپائیں گے پڑی زاد صاحب..... میں آپ کو اتنا کم زور نہیں سمجھتا تھا۔“ ڈاکٹر عدنان میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا، آس پاس چلتے لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ یعنی وہیں زور بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے عدنان سے منت کی ”مجھے جانے دو عدنان..... اس کی جس ایک نظر سے بچنے کے لیے میں نے ساری دنیا تیاگ دی۔ وہ نظر میرا اچھا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی ہے۔ میں بہت بڑھال اور بڑا گھائل ہوں عدنان۔ مجھے اور زخمی نہ کرو۔ میرا دم میرے اس آخری بھرم

کے ساتھ نکل جانے دو.....“ عدنان کی آواز لرز رہی تھی، اس ایک نظر کا اتنا ہی خوف تھا تو پھر آپ نے یعنی سے محبت کیوں کی تھی.....؟“ ”نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے محبت نہیں کی۔“ عدنان نے میرے لرزتے ہاتھ قلم لیے۔ ”محبت نہیں کی، تو پھر یہ جو گ، تیاگ کیسا؟ اس کا سامنا کرنے کا خوف کیوں۔ کمانی نے امریکا سے واپسی ہی پر ہمیں سب بتا دیا تھا۔ کاش! آپ مجھ سے یہ بات نہ چھپاتے۔ اور پھر ہر گز خود گھنٹی گئی۔ آپ نے میری محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کر لیا پری زاد، آخر کیوں؟ ایسا کون کرتا ہے، چھین لیٹے اُسے مجھ سے۔ اُس پر سب سے زیادہ حق اس ساری دنیا میں صرف آپ کا تھا۔ آپ نے وہ حق بھی مجھے سونپ دیا۔ صرف اس خوف سے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد آپ کو قبول نہیں کرے گی۔ آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ زندگی کے اتنے اہم موضوع پر اپنے فیصلے کیسے کرے گی۔ اس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مان دیا۔ اس کے کتنے بھرم آپ سے بڑے تھے اور آپ اسی کوچ مندر حار میں چھوڑ آئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ آپ کے بغیر کیسے چل پائے گی؟“ میں نے اپنی سانسیں جمع کیں۔ ”میں اس کی نئی رنگوں سے بھری دنیا کو اپنے وجود کی کالک سے سیاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف تم ہی اس کے قابل تھے اور میں نے صرف تمہارے بھروسے اُسے چھوڑا تھا، میں جانتا تھا۔ اگر میں اس کا ہاتھ مانگتا، تو وہ مجھے دیکھ کر بھی شاید انکار نہ کرتی۔ کیوں کہ اس کی روح میرے اُن گنت احسانات کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی، لیکن مجھے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہیے تھا عدنان..... میری منزل تو بس ایک نظر تھی۔ اس کی پیاد بھری ایک نظر۔“ عدنان نے حتیٰ لچے میں کہا۔ ”خفیک ہے، اگر آپ کو نظر کی پہچان کا اتنا ہی دعویٰ ہے، تو آج یہ بھرم بھی آزمالیتے ہیں۔ وہ آ رہی ہے، دیکھتے ہیں آپ کو دیکھ کر اس کی نظر کیا کہتی ہے۔ آج آپ کے مقدور کی وہ نظر خود فیصلہ کرے گی، جب آپ حسب وعدہ آپریشن سے پہلے نیویارک نہیں پہنچے، تو یعنی نے اپنی آنکھوں کے آپریشن سے انکار کر دیا تھا، وہ جان گئی تھی کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ میں نے آپ کی قسم دے کر اس کا آپریشن تو کروادیا، مگر بیٹائی ملنے کے بعد بھی اس نے اپنی آنکھوں پر آج تک وہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔“ میں چلا اٹھا، ”مگر کیوں، تم نے تو اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔“ ”تمہی یعنی کی آواز میرے قریب سے اُبھری۔“ وعدے تو آپ نے بھی بہت کیے تھے دوستی نبھانے کے پری زاد..... آپ یہ کیسے بھول گئے کہ میرا آپ سے روح کا رشتہ تھا۔ اور جب روح کے رشتے بڑ جائیں تو پھر بے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آپ کو مجھ پر اتنا بھروسہ بھی نہیں تھا۔ بس، اتنا ہی جانتے تھے آپ مجھے۔“ خانو نے صورت حال کی یقینی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ میں وہیں زمین پر پڑا بارش میں بیگ رہا تھا۔ یعنی نے وہیں زمین پر دوڑا تو میچ کر میرا سراپا اپنی گود میں رکھ لیا۔ میری جلتی روح کسی صحنہ پانی کی ابتلا تلتے آ گئی۔ اس نے میرے پیرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، تو مجھے یوں لگا، جیسے ہر داغ، ہر سیاہی دھلتی چلی گئی ہو۔ میں اس کے ٹھوکتے ہی کتنا خوب صورت ہو گیا تھا۔ ”پری زاد“ ”ہن گیا تھا۔ یعنی نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار لیا، میرے نصیب کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ کسی بھی طنز، حقارت، قسطنطنیہ از نظر سے مبرا۔ ایک پیاد بھری نظر۔ میرے مقدور کی نظر.....“ وہ میرا سر گود میں لیے بیٹھی روتی رہی۔ اور برستی بارش کی بوندیں، اس کے پاک اور معطر آنسوؤں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے خود ان آنسوؤں میں مل کر پاک ہوتی رہیں۔ ”میں بھی کتنی بد نصیب ہوں۔ آپ نے سب سے بچھا کر جس محبت کو اپنے من میں دبائے رکھا، اس کی خبر میرے سوا باقی سب کو تھی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھ سے کہہ کر تو دیکھتے..... تب میں آپ کو بتائی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں..... اتنا کم زور سمجھ کر کھاتا تھا آپ نے قراۃ العین کو۔“

دور کھڑے تھاکے فرشتے نے مجھے اشارہ کیا۔ ”انشاء الی اللہ..... اب کوچ کرو۔“ میں نے چند سانسیں مزید اُدھار مانگیں اور اس مددگار کے ہاتھوں کو قلم لیا۔ ”نہیں یعنی..... میں تم پر زندگی کے رنگوں کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا تھا، میرے نہ ہونے سے تمہاری روشن دنیا میں ایسی کون سی کمی ہو جاتی۔ میں تو یوں بھی تمہاری زندگی میں اضافی تھا۔“ اس کے آنسو بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ مل کر میرے پیرے کو پاک کرتے رہے۔ ”پہلے میں خود نہیں جانتی تھی پری زاد، مگر آپ سے دُور ہو کر جانا کہ میری ہر کمی آپ ہی سے پوری ہوتی ہے۔ آپ نے خود کبھی کہا نہیں اور مجھے امریکا جا کر پتا چلا کہ آپ اضافی نہیں، لازمی ہیں۔“ میں نے یعنی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں قلم کر بائلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہاں..... کبھی نہیں کہہ پایا، مگر آج کہتا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے قراۃ العین..... شدید محبت۔“ میری نبض ڈوب رہی تھی، میرے کان میں قضا دجیرے سے گنگنائی۔ ”وحشی کو سکوں سے کیا مطلب..... جو گی کا گنگر میں ٹھکانہ کیا؟“ اس پاس کا سارا شور مجھے دجیرے دجیرے سے سرگوشیوں میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ جانے لوگ آپس میں کیا سرگوشیاں کر رہے تھے؟ بارش تیز تر ہو کر بھی مجھے بھگو نہیں پاری تھی۔ اتنی تیز آمدھی کے باوجود، جس سے میرا دم کیوں گھٹ رہا تھا، وہ میرا سر گود میں لیے دارو و قطار رو رہی تھی۔ زندگی سمٹ کر ان چند لمحوں میں سمٹ آتی ہے، جب طر بھر کی ریاضت اور دعائیں رنگ لاتی ہیں۔ آج میری طر بھر کی چٹیا بھی پوری ہوئی۔ اب بھلا کس کو بچنے یا مرنے سے غرض تھی۔ کتنی صدیاں اس ایک پل میں جی تی تھیں میں نے۔ زندگی نے ہر قرض نکا دیا تھا، میری اضافی اور مانگی ہوئی سانسیں پوری ہونے کو آئیں، تو آس پاس دجیرے دجیرے روشنی کم ہونے لگی، میری آنکھیں پتھر آنے لگیں، کبھی مٹا تھا کہ دھڑکن بند ہو بھی جائے تو دماغ کچھ لمبے زیادہ جیتا ہے۔ چاروں طرف ایک عجیب سا شور مچ گیا، جیسے بہت سے لوگ مل کر چین کر رہے ہوں۔ جانے سب روکیوں رہے تھے، میری پتھرائی آنکھیں تو ابھی تک اُسی نظر پر جمی ہوئی تھیں، جس نے میری پھیل کر دی تھی۔ خانو دھاڑیں مار مار کر سب سے پلٹ کر میری طرف اشارے کر کے جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ عدنان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ اس نے یعنی کو قلم رکھا تھا۔ ہاں، اب وہی تو اس کا سہارا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر میرے زہم پر سفید چادر ڈال دی۔ میرا چہرہ واضح رہا۔ مجھے اپنے قدموں کی جانب سے خون کی گردش رک کر سارے جسم میں جامہ ہوتی محسوس ہوئی اور میرے ذہن کے اند جیرے بڑھنے لگے، پھر کسی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ کہہ کر میرے چہرے پر ہند کر دیئے۔ اور میرا دماغ ہمیش کے لیے اند جیروں میں ڈوب گیا۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

ضروری بات کہتی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو

اُسے آواز دینی ہو، اُسے واپس بلانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

مدد کرنی ہو اُس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

بہت دیر بند رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

بدلتے موسموں کی سیر میں، دل کو لگانا ہو

کسی کو یاد رکھنا ہو، کسی کو بھول جانا ہو

کسی کو موت سے پہلے، کسی غم سے بچانا ہو

حقیقت اور تھی کچھ، اُس کو جاکے یہ بتانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

(ختم شد)